رجسٹرڈ ایل نمبر 7360

عدد ۴

ماہنامہ

میثاق

لاہور

•

زیرِ ادارت

امین احسن اصلاحی

•

دفتر رسالہ میثاق

رحمانپورہ اچھرہ - لاہور

قیمت فی پرچہ ۱۰ آنے

سالانہ ۶ روپے

رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۶۰

ہندوستانی خریداروں کے لیے
ارسال زر کا پتہ
منیجر "الفرقان" کچہری روڈ لکھنؤ

ماہنامہ میثاق لاہور

فہرست مضامین

جلد ۲ | بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۶۰ء مطابق رمضان المبارک سنہ ۱۳۷۹ھ | عدد ۴

تذکرہ وتبصرہ — امین احسن اصلاحی — ۲

تدبر قرآن

تفسیر سورہ بقرہ — " — ۹

مطالعہ حدیث

دعا — مولانا عبدالغفار حسن صاحب — ۱۹

تزکیۂ نفس

تعلق باللہ کی اساسات — امین احسن اصلاحی — ۳۳

سفر حج

واپسی — " — ۴۱

مراسلہ ومذاکرہ

جزا وسزا اتمام حجت کے ساتھ ہے — ۴۸

ختم نبوت کے بعد ہدایت خلق کا انتظام

حضرت ابوہریرہؓ کی روایت حدیث اور حضرت عمرؓ

محی الدین پرنٹر پبلشر نے اشرف پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر ماہنامہ میثاق ۱۱- احمد سٹریٹ سمن پورہ اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ہمیں یہ معلوم کرکے افسوس ہوا ہے کہ ہماری حکومت نے عائلی کمیشن کی رپورٹ منظور کرلی ہے اور اس کی سفارشات کے مطابق نکاح و طلاق اور کفالت و وراثت وغیرہ سے متعلق مروجہ قوانین میں وہ اصلاح و ترمیم کردینا چاہتی ہے۔ مذکورہ کمیشن ۱۹۵۵ء میں پاکستان کی مرکزی حکومت نے قائم کیا تھا اور اس کی رپورٹ جون ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ جس وقت یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی اس وقت اس ملک کے تمام دینی حلقوں اور عام مسلمانوں کی طرف سے اس کی شدید مخالفت ہوئی تھی لیکن اب چونکہ اس ردعمل پر ایک عرصہ گذر چکا ہے، یہ باتیں ہماری موجودہ حکومت سے پہلے کی ہیں ممکن ہے لوگوں کے عام احساسات اس رپورٹ کے بارے میں حکومت کے سامنے نہ ہوں اس وجہ سے ہم صدر ریاست فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے سامنے اس رپورٹ کے بعض پہلوؤں کو لانا چاہتے ہیں اور ان سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہماری ان معروضات پر غور فرمائیں گے۔ انھوں نے اپنی تقریروں میں اسلام اور اسلامی شریعت سے متعلق مسلسل اپنے جن جذبات و خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی بنا پر ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ جان بوجھ کر کوئی ایسی بات پسند نہیں کریں گے جو اسلام اور اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔

اس کمیشن سے متعلق سب سے زیادہ خاص بات جو جاننے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے ذمہ جو کام سپرد کیا گیا تھا وہ کوئی عام قسم کی قانونی ترمیمات و اصلاحات تجویز کرنے کا کام نہیں تھا بلکہ خالص شرعی قوانین و احکام سے تعلق رکھنے والا کام تھا اور یہ شرعی احکام و قوانین بھی عام قسم کے نہیں تھے بلکہ ہر مسلمان کی شخصی زندگی سے تعلق رکھنے والے تھے جن کے بارے میں لوگوں کے احساسات حلت و حرمت بڑے نازک ہوتے ہیں اور حکومتیں ان کا بڑا احترام ملحوظ رکھتی ہیں لیکن کام کی اس اہمیت و نزاکت کے باوجود اس کمیشن کے لیے جو اشخاص منتخب کیے گئے ان میں ایک صاحب کے سوا بقیہ جتنے اصحاب بھی تھے وہ نہ صرف یہ کہ اسلامی شریعت کے علم سے بالکل بے بہرہ تھے بلکہ بعضوں کے متعلق تو یہ کہنے میں بھی ہمیں کوئی تکلف نہیں ہے کہ اسلامی شریعت کے باب میں وہ اپنے مخالفانہ جذبات اور غیر ذمہ دارانہ خیالات و نظریات کے لیے مسلمانوں میں ہمیشہ بدنام رہے۔

ممکن ہے ہمارے صدر ریاست کے سامنے اس وقت وہ سارے نام نہ ہوں اس وجہ سے ہم کمیشن کے ارکان کے ناموں کی یاد دہانی کردینا چاہتے ہیں۔ یہ کمیشن مندرجہ ذیل حضرات پر مشتمل تھا۔

خلیفہ عبدالحکیم صاحب مرحوم
مسٹر عنایت الرحمٰن صاحب
بیگم شاہنواز
بیگم انور جی احمد
بیگم شمس النہار محمود
مولانا احتشام الحق صاحب

ابتداءً اس کے صدر خلیفہ شجاع الدین مرحوم بنائے گئے تھے لیکن کمیشن کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد خلیفہ صاحب کا انتقال ہوگیا اور ان کی جگہ پر میاں عبدالرشید صاحب کا انتخاب عمل میں آیا۔

اس فہرست پر ایک نظر ڈال کر صدر ریاست خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ان میں سے ایک صاحب کے سوا کن صاحب یا صاحبہ کی نسبت مسلمان یہ حسن ظن قائم کرسکتے تھے کہ ان کو فقہ و حدیث اور اسلامی شریعت کا اتنا علم ہے کہ وہ اسلام کے عائلی قوانین میں ترمیم و اصلاح تجویز کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ہمیں ان فاضل ارکان کی دوسری صلاحیتوں اور قابلیتوں کا انکار نہیں ہے، وہ علم و فضل کے بلند سے

بلند مرتبہ پر فائز سہی، سوال اس دین اور شریعت کے علم سے متعلق ہے جس کے ایک نہایت ہی اہم اور نازک شعبہ سے متعلق ان کو سفارشات مرتب کرنے کی خدمت سپرد ہوئی تھی؟

ان میں تنہا مولانا احتشام الحق تھانوی ایک ایسے بزرگ تھے جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ شریعت کے عالم ہیں لیکن ہم صدر ریاست کے علم میں یہ بات لانا چاہتے ہیں کہ مولانا موصوف نے کمیشن کی سفارشات سے اسی زمانہ میں اپنی کلی برأت کا اعلان کر دیا تھا اور ان کا یہ اعلان پوری تفصیل کے ساتھ اسی زمانہ میں حکومت کے سامنے بھی آگیا تھا اور پبلک کے سامنے بھی۔ اب قابل غور بات یہ ہے کہ ایک کمیشن جو خالص شرعی مسائل سے متعلق سفارشات مرتب کرنے کے لیے بٹھایا جاتا ہے، اس کے ارکان میں سے جو واحد رکن دین کا جاننے والا ہے جب وہی اس کی سفارشات سے کھلم کھلا اپنی برأت کا اعلان کر دیتا ہے تو آخر دینی اعتبار سے اس کمیشن کی سفارشات اور تجاویز کا کیا وزن باقی رہ جاتا ہے۔ حقیقت نفس الامری خواہ کچھ ہو لیکن ایک عام مسلمان تو اس صورت میں یہی رائے قائم کرے گا کہ یہ سفارشات شریعت کے بالکل خلاف ہیں۔

ہم صدر ریاست کے علم میں یہ بات بھی لانا چاہتے ہیں کہ اس کمیشن کی پیش کردہ رپورٹ کی مخالفت صرف احتجاجی تقریروں ہی کے ذریعہ سے نہیں ہوئی تھی بلکہ نہایت مدلل اور سنجیدہ علمی مقالات و مضامین کے ذریعہ سے بھی ہوئی تھی۔ یہ تنقیدی مضامین لکھنے والوں میں ہر طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ ان مضامین میں ان سفارشات کا صرف خلاف شریعت ہونا ہی نہیں دکھایا گیا تھا بلکہ نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی تھی کہ اگر یہ سفارشات عملاً نافذ ہو گئیں تو ہماری معاشرتی زندگی کا پورا ڈھانچہ بالکل درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اور ان کے نفاذ سے سب سے زیادہ نقصان ہمارے معاشرہ کے انہی اجزاء کو پہنچے گا جن کی بہبود کو پیش نظر رکھ کر ہی بظاہر یہ سفارشات مرتب کی گئی ہیں۔

خود راقم نے بھی ان سفارشات کا بڑا تفصیلی تنقیدی جائزہ لیا تھا اور اس جائزہ میں ہم نے نہایت مضبوط دلائل کے ساتھ یہ دکھایا تھا کہ یہ سفارشات بجز چند ایک کے، نہ صرف قرآن و حدیث کے

خلاف ہیں بلکہ ان لوگوں کے مفاد کے بھی خلاف ہیں جن کی خاطر یہ مرتب کی گئی ہیں۔ ہمارا یہ تنقیدی جائزہ اخبارات و رسائل میں بھی آچکا ہے اور اسی زمانہ میں کتابی شکل میں بھی چھپ کر ایک وسیع حلقہ میں پھیل چکا ہے۔ ہم آج بھی ان سفارشات کے متعلق یہی رائے رکھتے ہیں کہ اگر یہ قانون بن کر عملاً نافذ ہو جائیں تو ان سے ہمارے معاشرہ کے ہر طبقہ کو نہایت شدید نقصان پہنچے گا۔ ہم صدر ریاست کی مصروفیتوں کو جانتے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کی ذمہ داریوں اور مسؤلیتوں کو بھی جانتے ہیں اس وجہ سے ہم ان سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ اس سلسلہ کی ضروری چیزیں بذات خود ملاحظہ فرمائیں اس لیے کہ عنداللہ اور عندالناس جو ذمہ داری ان کی ہے وہ کسی کی بھی نہیں ہے۔

انگریزوں نے ہمارے پرسنل لا میں اگر کوئی مداخلت پسند نہیں کی تھی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی، جیسا کمیشن نے سمجھا ہے، کہ وہ ہم کو ترقی سے محروم رکھنا چاہتے تھے۔ نسوانی آزادی اور اخلاقی بے قیدی کی جو برکات وہ اس ملک میں لائے ان میں ہم نے جتنا بھی حصہ لیا عین ان کی آرزوؤں کے مطابق تھا اور جتنا بھی حصہ لیتے ٹھیک ان کی خواہشوں کے مطابق ہوتا۔ اس ترقی سے ہمیں محروم کر کے وہ کیا فائدہ حاصل کر سکتے تھے؟ انھوں نے اگر ہمارے پرسنل لا میں مداخلت نہیں کی تو اس کی وجہ یہ اور صرف یہ تھی کہ وہ ایک سیاسی قوم ہونے کے سبب سے پرسنل لا کی نزاکتوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ دین کا یہ حصہ ہر شخص کی زندگی سے فرداً فرداً تعلق رکھنے والا ہوتا ہے، اس کے بارے میں عوام و خواص سب ہی کے احساسات بہت نازک ہوتے ہیں، بالخصوص عوام کا تو اصل دین ہی اتنا ہوتا ہے جتنا پرسنل لا سے تعلق رکھنے والا ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے نہ صرف انگریزوں نے بلکہ دنیا کی کسی بھی سیاسی قوم نے کبھی اپنی رعایا کے پرسنل لا سے کبھی تعرض کرنے کی غلطی نہیں کی ہے۔ اب ہمارے صدر ریاست غور فرمائیں کہ ہمارے دین کا جو حصہ انگریزوں کے زمانہ میں بھی محفوظ رہا، ہمارے لیے یہ کتنی مایوسی اور دل شکستگی کی بات ہوگی، اگر وہ اس زمانہ میں آکر خطرہ میں پڑ جائے جب کہ اس ملک میں ہماری اپنی حکومت قائم ہو چکی ہے، جس سے ہر مسلمان کو بجا طور پر یہ توقع ہے کہ وہ نہ صرف پرسنل لا کے دائرہ میں بلکہ زندگی کے ہر شعبہ اور ہر گوشہ میں اللہ اور اس کے رسول کے قانون کو جاری کرے گی۔

ہمارے صدر ریاست سے معاملہ کی نزاکت کا یہ پہلو بھی مخفی نہیں ہو سکتا کہ کسی مخالف اسلام بات کو

من مانے طور پر گزرنا اور چیز ہے اور کسی مخالف اسلام بات کے متعلق یہ دعویٰ کرنا کہ یہی عین اسلام ہے اور چیز ہے۔ کمیشن نے جو سفارشات کی ہیں ان کی نوعیت صرف سفارشات کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ایک ایک چیز کے متعلق یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ یہی عین اسلام یا مقتضائے اسلام ہے۔ کمیشن نے جن چیزوں کو عین اسلام یا مقتضائے اسلام بتایا ہے ان میں سے اکثر باتیں ایسی ہیں جو اسلام کی چودہ سو سال کی تاریخ میں اسلام کے بالکل خلاف اور حرام سمجھی گئی ہیں۔ مسلمانوں کے تمام متفق علیہ اماموں، تمام علما، تمام فقہا نے ان کے خلاف فتوے دیئے ہیں۔ اسلامی قانون کی تمام کتابیں ان کے خلاف گواہی دے رہی ہیں، تمام مسلمانوں کا عمل ان کے خلاف رہا ہے۔ ایسے حالات میں ہمارے لیے یہ باور کرنا مشکل ہے کہ اہل ایمان کے ضمیر ان اصلاحات کو اسلام سمجھ سکیں گے۔ بلکہ ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان اصلاحات کے نفاذ کی صورت میں ہر خدا ترس مسلمان اپنی اپنی جگہ پر ایک سخت روحانی اذیت محسوس کرے گا جب کہ وہ دیکھے گا کہ اپنے ایمان و ضمیر کی روشنی میں جس چیز کو وہ حرام سمجھتا ہے قانون ملکی کے تحت اس کو اس چیز کا ارتکاب کرنا پڑ رہا ہے۔ اور اس تحکم کے ساتھ کہ اب یہی اسلام ہے۔

ہماری یہ گذارشات تو صدر ریاست کی خدمت میں تھیں۔ اب ہم آخر میں مولانا مفتی شفیع صاحب دیوبندی، مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی، مولانا داؤد صاحب غزنوی، مولانا ابوالحسنات صاحب، علامہ حافظ کفایت حسین صاحب اور مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی سے یہ گذارش کریں گے کہ یہ حضرات ایک وفد کی شکل میں صدر ریاست سے ملاقات کریں اور ان کے سامنے اس مسئلہ کے سارے پہلوؤں کو رکھیں۔ ہمیں امید ہے کہ اس کے نتائج نہایت عمدہ ہوں گے۔ اور اگر خدانخواستہ اس سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو کم از کم ان کی طرف سے حق نصیحت و خیر خواہی تو ادا ہو جائے گا۔

(۲)

پاکستان و ہندوستان کے متعدد مخلصین نے ہمیں کراچی کے ایک معاصر کے ایک مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے جو معاصر مذکور کی مارچ کی اشاعت میں "پردہ اٹھنے کے بعد" کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضمون مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ پورا مضمون نہایت ہی توہین انگیز اور حد درجہ دل آزار ہے۔ یہ معاصر مولانا کے متعلق اسی قسم کا ایک دل آزار مضمون اس سے پہلے بھی

اس بےکسی میں یارو، کچھ بن پڑے تو جانیں
جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

بہرحال مولانا کے متعلق اس طرح کی بحثیں جو لوگ چھیڑ رہے ہیں، ان کے ظرف کے متعلق کوئی اچھی رائے نہیں قایم کی جاسکتی۔ مولانا آزاد ان حضرات کے نزدیک واقدی کی طرح کذاب ہیں۔ لیکن ان کی یہی ایک خوبی ان حضرات کی تمام خوبیوں پر بھاری ہے کہ ان کی ذات پر جب بھی اس قسم کے شریفانہ حملے کیے گئے انھوں نے کبھی ان کا نوٹس نہیں لیا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر بات یہ ہے کہ اپنے اس قسم کے کرم فرماؤں کے ساتھ ان کی مشکلات میں انھوں نے نہایت اچھا سلوک کیا۔ ان کی طبیعت میں بڑی بلندی تھی اور اس بلندی کی وجہ سے وہ لوگوں کی حاسدانہ باتوں کی کبھی پروا نہیں کرتے تھے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ ابتدا ہی سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسی عظمت و شہرت عطا فرمادی تھی کہ ان کو اپنی شہرت و عظمت کی تعمیر کے لیے دوسروں کی شہرت پر حملہ کرنے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔

مولانا آزاد جیسے لوگوں پر اگر کسی کو بحث کرنی ہو تو ان کے افکار و نظریات پر کرے اس لیے کہ اس طرح کے لوگوں کے افکار و نظریات سے ہزاروں انسانوں کی زندگیاں بنتی اور بگڑتی ہیں۔ مولانا آزاد کے بعض افکار و نظریات سے ہمیں بھی اختلاف ہوا ہے اور ہم نے اپنے اس اختلاف کا اپنی تحریروں میں اظہار بھی کیا ہے لیکن اس اختلاف کے باوجود ہماری نظروں میں ان کی عزت و عظمت کبھی کم نہیں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کو قبول فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگذر فرمائے اور ان کی ذات پر اس قسم کے شریفانہ حملے کرنے والوں کو توفیق دے کہ یہ اپنے زبان و قلم کی صلاحیتیں کسی مفید مقصد کے لیے استعمال کریں اور دوسروں کا پردہ اٹھانے کے بجائے اپنا پردہ قایم رکھنے کی کوشش کریں۔

معاصر موصوف نے یہ سوال بھی اٹھایا ہے کہ مولانا کے سائے تربیت یافتہ ملحد اور بے دین ہیں اور اس سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ مولانا بھی ایک ملحد و بے دین تھے۔ یہ نکتہ اگر صحیح ہے تو کیا یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اسی نکتہ کی روشنی میں ان بزرگوں کے متعلق کیا رائے قایم کی جائے جن کے فیض تربیت کا یہ مظاہرہ معاصر موصوف نے کیا ہے اور جن کو اپنے صفحات میں وہ ہم رتبہ ابن تیمیہؒ و شاہ ولی اللہ قرار دیتا رہا ہے۔

(باقی صفحہ ۵۶ پر)

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورہ بقرہ

(۹)

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ قَالُوْٓا
اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَ
عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ
فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۝۳۱ قَالُوْا
سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ۝۳۲
قَالَ یٰۤاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّاۤ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ
وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝۳۳ وَاِذْ قُلْنَا
لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ

وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ٣٤ وَقُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ
الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ
الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ ٣٥ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا
فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ص وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ
عَدُوٌّ ج وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝ ٣٦ فَتَلَقّٰۤى
اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ط اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ٣٧
قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ
تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ٣٨ وَالَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰۤئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ۝ ٣٩ ع

اور یاد کرو جب کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں ، انھوں نے کہا کیا تو اس میں اس کو خلیفہ مقرر کرے گا جو اس میں فساد مچائے اور خونریزی کرے اور ہم تو تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح کرتے ہی ہیں اور تیری پاکی بیان کرتے ہی ہیں ؟ اس نے کہا میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے سکھا دیئے آدم کو سارے نام ، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ اگر تم سچے ہو تو مجھے ان لوگوں کے ناموں سے آگاہ کرو ۔ انھوں نے کہا کہ تو پاک ہے ، ہمیں تو تو نے جو کچھ بتایا ہے اس کے سوا کوئی علم نہیں ۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے ۔ کہا اے آدم ! ان کو بتاؤ ، ان لوگوں کے نام ۔ تو جب اس نے بتائے ان کو ان لوگوں کے نام تو اس نے کہا کیا میں نے تم سے نہیں کہا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید کو میں ہی جانتا ہوں اور میں جانتا ہوں اس چیز کو جس کو تم ظاہر کرتے ہو

اور جس کو تم چھپاتے تھے ۔

اور یاد کرو جب کہ ہم نے کہا فرشتوں سے کہ آدم کو سجدہ کرو تو انھوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے ، اس نے انکار کیا اور گھمنڈ کیا اور کافروں میں سے بن گیا ۔ اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری بیوی دونوں رہو جنت میں اور اس میں سے کھاؤ فراغت کے ساتھ جہاں سے چاہو اور اس درخت کے پاس نہ پھٹکنا ورنہ ظالموں میں سے بن جاؤ گے ۔ تو شیطان نے ان کو وہاں سے پھسلا دیا اور ان کو نکلوا چھوڑا اس عیش و آرام سے جس میں وہ تھے ۔ اور ہم نے کہا کہ اترو تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے اور تمہارے لیے ایک وقت خاص تک زمین میں رہنا بسنا اور کھانا برتنا ہے ۔ پھر آدم نے پا لیے اپنے رب کی طرف سے چند کلمات تو اس نے اس کی توبہ قبول کی ۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے ۔ ہم نے کہا اترو یہاں سے سب ، تو اگر آئے تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے تو ان کے لیے نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔ اور جو کفر کریں گے اور جھٹلائیں گے میری آیتوں کو وہی لوگ دوزخ والے ہیں ، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے ۔

۲۶ - الفاظ اور جملوں کی تشریح

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰۤئِكَةِ | عربی زبان میں جب کلام کا آغاز "اذ" سے ہوتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اس سے پہلے خیال کرو ، تصور کرو ، یاد کرو یا ان کے ہم معنی کوئی فعل یہاں محذوف ہے ۔ عموماً اس کے بعد کسی ایسی سرگذشت یا واقعہ کا حوالہ آتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہو ، یا خود متکلم اس کی قطعیت پر اس درجہ مطمئن ہو کہ ایک معلوم و معروف حقیقت کی حیثیت سے اس کا حوالہ دے سکے ۔ یہاں اگرچہ آدم ، ملائکہ اور ابلیس سے متعلق ایک ایسے ماجرے کا حوالہ دیا گیا ہے ، جو عالم غیب میں پیش آیا ہے اور جس کا علم خدا کے سوا کسی کو بھی نہیں ہے لیکن مخاطب یہاں اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے لیے زبان وحی کی ہر بات ایک امر واقعی اور ایک حقیقت ثابتہ کی حیثیت رکھتی تھی ، ثانیاً اس سرگذشت کا اصل رخ ، جیسا کہ اوپر اشارہ کیا گیا ، یہود کی طرف ہے اور یہود

تورات کے ذریعہ سے اس ماجرے سے واقف تھے اگرچہ انھوں نے تحریف کر کے اس کی اصل شکل بہت کچھ بدل ڈالی تھی۔

"ملائکہ" ملک کی جمع ہے۔ عربی زبان میں الوکہ کے معنی پیغام کے آتے ہیں اور ملک (جس کی اصل ملاک ہے) کے معنی رسول اور پیغام بر کے ہیں۔ یہ لفظ ان روحانی پیغامبروں کے لیے مخصوص ہے جن کو ہم اپنی زبان میں فرشتہ کہتے ہیں۔ فرشتے اللہ تعالیٰ اور اس کی دوسری مخلوقات کے درمیان قابلِ اعتماد واسطہ ہیں۔ یہ اپنی روحانیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ سے بھی غایت درجہ قرب واتصال رکھتے ہیں اور مخلوق ہونے کے سبب سے مخلوقات سے بھی نسبت اور تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والے انوار وترشحات کے بلا واسطہ قبول کرنے کی صلاحیت بھی ہے اور یہ ان انوار وترشحات کو اللہ تعالیٰ کے بندوں تک منتقل کرنے کی قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے نبیوں اور رسولوں کے پاس وحی بھی لاتے ہیں اور اس کی مخلوق کے اندر اس کے احکام کی تنفیذ بھی کرتے ہیں۔ قرآن میں ان کی جو صفات بیان کی گئی ہیں وہ تمام تر ایک ذی عقل، ذی ارادہ اور ذی شعور مخلوق کی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ صفات ہیں اس وجہ سے جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ مجرد قوتیں ہیں جن کو ملائکہ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ان کا خیال صحیح نہیں ہے۔

انی جاعل فی الارض خلیفۃ خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لیے اس کی جگہ لے۔ اس وجہ سے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے زمین میں کس کا خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ اپنا یا زمین میں لبنے والی کسی پیشرو مخلوق کا؟ ایک رائے یہ ہے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات آباد تھے۔ جب انھوں نے اس میں فساد مچایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پراگندہ ومنتشر کر دیا اور ان کی خلافت بنی نوع انسان کے سپرد فرمائی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں خود اپنا خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ پہلی رائے اگرچہ بالکل بے بنیاد تو نہیں کہی جا سکتی لیکن قرآن یا تورات یا کسی قابلِ اعتماد حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات کی حکمرانی تھی، اس کی تائید میں اگر کوئی چیز پیش کی جا سکتی ہے تو اس کی حیثیت اشارہ وکنایہ سے زیادہ نہیں ہے اور محض کسی اشارہ وکنایہ پر ایک حقیقت کی بنیاد رکھ دینا ہمارے

نزدیک صحیح نہیں ہے۔

دوسری رائے مختلف اعتبارات سے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی فضیلت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں، فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں، نیز اس کے بارے میں فرمایا کہ جو امانت آسمان اور زمین اٹھانے سے قاصر رہے اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ یہ ساری باتیں اس امر کے حق میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہو، لیکن ان تمام دلائل کے باوجود ایک سوال اس رائے سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ خلیفہ تو اس کو مقرر کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے جو غائب یا غیر حاضر ہو تا ہو، خدا تو نہ کبھی غائب ہوتا ہے نہ غیر حاضر، آسمان و زمین ہر جگہ اس کی حکومت ہمیشہ رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی پھر اس کے کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے کیا معنی؟

یہ سوال ہمارے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام وانصرام کے معاملہ میں کچھ اختیارات دے کر یہ دیکھے گا کہ انسان ان اختیارات کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا خلافت پا کر وہ مطلق العنان بن جاتا ہے اور اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ گویا اصل حکمراں کی طرف سے ایک نائب مقرر کیے جانے کی شکل ہوئی اور اس نائب کے تقرر کی ضرورت یہ نہیں تھی کہ اصل حکمراں کو غائب یا غیر حاضر ہونا تھا بلکہ اس نائب کو کچھ اختیارات دے کر مقصود اس کی اطاعت ووفاداری کا امتحان کرنا تھا۔

قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء قرآن مجید کی اصطلاح میں فساد فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ زمین کا نظم ونسق، اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین کے مطابق چلانے کے بجائے اس کو من مانے طریقہ پر چلایا جائے، خدا کی شریعت کی نافرمانی کی جائے اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی جائے، زمین کے اصل حکمراں کی مرضی نظر انداز کی جائے اور خود اپنی مرضی چلائی جائے۔ یہ چیز بجائے خود فساد فی الارض اور بغاوت ہے، عام اس سے کہ یہ دھینگا مشتی اور سرکشی کے ساتھ واقع ہو یا کسی فکر و فلسفہ کے تحت پرامن طریقہ پر۔ اس زمین کا اصل حکمراں اللہ تعالیٰ ہے۔ انسان کی حیثیت اس کے اندر اصل حکمراں کی نہیں بلکہ اصل حکمراں کے نائب کی ہے۔ اس وجہ سے اس زمین کے امن وعدل کا انحصار اس چیز پر ہے کہ اس کے ہر گوشے میں خدائی قانون چلے۔ اگر اس کے کسی حصہ

میں بھی خدا کا قانون باقی نہیں رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس حصے میں بغاوت پھوٹ پڑی ہے اور یہ چیز اس پوری زمین کے لیے ایک خطرہ ہے۔

خونریزی فساد فی الارض کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب خدا کا قانون عدل باقی نہیں رہے گا تو لازماً اس کی جگہ انسان کی اپنی خواہشات کی فرمانروائی ہوگی۔ اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ کسی شخص کے بھی جان یا مال یا اس کی آبرو کے لیے کوئی ضمانت باقی نہیں رہے گی۔ کسی خاص خطۂ زمین کے مفسدین بالفرض کوئی ایسا نظام بنا بھی لیں جس میں باہدگر ایک دوسرے کے جان و مال کی حفاظت کی ضمانت دے دیں تو اس سے وہ اپنے لیے تو ایک تحفظ کی شکل پیدا کر لیں گے لیکن دوسروں کے لیے وہ بدستور خطرہ ہی بنے رہیں گے۔ ان کی مثال ڈاکوؤں کے ایک جتھے کی ہوگی جس کے افراد نے آپس میں تو یہ سمجھوتہ کر رکھا ہے کہ ایک دوسرے کے جان و مال پر دست درازی نہیں کریں گے لیکن ان کے جتھے سے باہر والوں کے جان و مال کو ان کی چیرہ دستیوں سے بچانے والی کوئی چیز بھی نہیں ہوگی۔ تمام عالم انسانی اور پورے کرۂ ارضی کے تحفظ کی ضمانت صرف خدا کا قانون ہی دے سکتا ہے جو سب کے جان و مال کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو یکساں پابند کرتا اور یکساں آزادی بخشتا ہے۔

فرشتوں نے انسان کے بارے میں اس اندیشہ کا اظہار اس کے خلیفہ ہونے کی بنا پر کیا، اس لیے کہ خلیفہ کے لفظ کے اندر یہ چیز چھپی ہوئی ہے کہ اس کو ایک خاص حد کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اختیارات تفویض ہوں گے۔ فرشتوں نے محسوس کیا کہ اختیار کو استعمال کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے، اس کو پا کر انسان بہک سکتا ہے اور اس بہکنے کا نتیجہ زمین میں بدامنی اور فساد کی شکل میں ظاہر ہو سکتا ہے۔

ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك تسبیح کی اصل حقیقت، لغت کے اعتبار سے، کسی کے سامنے عجز و تذلل کے ساتھ بچھ جانا ہے۔ تسبیح قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی ہوتی ہے۔ عمل سے خدا کی تسبیح کا مفہوم خدا کے احکام کی تعمیل میں ہر وقت سرفگندہ رہنا ہے۔ یہ تسبیح اس کائنات کی وہ چیزیں بھی کرتی ہیں جو غیر ذی روح اور غیر ذی ارادہ ہیں۔ انسان کے جس عمل کو قرآن نے خاص طور پر تسبیح سے تعبیر کیا ہے وہ نماز ہے اس لیے کہ نماز سرفگندگی اور عجز و تذلل کی نہایت مکمل تصویر ہے۔ قولی تسبیح سے مراد خدا کی پاکی بیان کرنا ہے۔ یعنی خدا کو ان باتوں سے منزہ اور بالاتر قرار

دینا جو اس کی شان الوہیت کے خلاف ہیں۔ اس اعتبار سے تسبیح میں منفی پہلو غالب ہے لیکن جب اس کے ساتھ حمد کی قید بڑھا دی جائے، جیسی کہ یہاں ہے، تو اس تنزیہہ کے ساتھ اثبات کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے، یعنی خدا کو منافی شان الوہیت صفات سے پاک قرار دینے کے ساتھ ساتھ ان صفات سے متصف بھی قرار دینا جن کی بنا پر وہ سزاوار حمد و شکر ہے۔

'نقدس لك' کا مفہوم یہ ہے کہ ہم تیری پاکی، تیری برتری اور تیری قدوسیت بیان کرتے ہیں۔ تسبیح میں تو جیسا کہ بیان ہوا، تنزیہہ کا مفہوم غالب ہے لیکن تقدیس کا مفہوم اللہ تعالیٰ کو پاکیزگی اور قدوسیت کی تمام صفات سے متصف قرار دینا ہے۔ تسبیح کے ساتھ تقدیس کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ جب تک انکار کے ساتھ یہ اقرار نہ ہو اس وقت تک اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کی تعریف کا حق نہیں ادا ہوتا۔

انسان کے متعلق مذکورہ بالا اندیشہ ظاہر کرنے کے بعد فرشتوں کی طرف سے اپنی اس تسبیح و تقدیس کا حوالہ دینا اس لیے نہیں تھا کہ انسان کے مقابل میں وہ خود اپنے حقدار خلافت ہونے کا اظہار کرنا چاہتے تھے، بلکہ اصل مقصود ان کا اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی حکمت و مصلحت معلوم کرنا تھا۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ایک طرف تو اس اندیشہ کو ظاہر کر دیا جو انسان کی خلافت کے اندر ان کو مضمر نظر آیا دوسری طرف اس بات کو بھی ظاہر کر دیا کہ انسان کی تخلیق سے مقصود محض تسبیح و تقدیس تو ہو نہیں سکتا، اس لیے کہ یہ کام تو ہم کر ہی رہے ہیں۔

قال انی اعلم مالا تعلمون فرشتوں کے مذکورہ بالا سوال کے جواب میں ارشاد ہوا کہ اس اسکیم کے سارے پہلوؤں پر تمہاری نظر نہیں ہے اس وجہ سے تمہارے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہوا ہے۔ جب پوری اسکیم تمہارے سامنے آجائے گی تو تم پر واضح ہو جائے گا کہ اس کے اندر اس اندیشہ کے سدباب کا اہتمام بھی ہے جو تم نے ظاہر کیا ہے۔

وعلم آدم الاسماء کلہا اللہ تعالیٰ نے آدم کو کن کے نام سکھائے؟ اس سوال کے جواب میں تین قول ہیں۔ ایک قول تو یہ ہے کہ اس سے مراد تمام چیزوں کے نام ہیں، دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد فرشتوں کے نام ہیں اور تیسرا قول یہ ہے کہ اس سے مراد آدم کی ذریت کے نام ہیں۔ ان میں سے جہاں تک دوسرے قول کا تعلق ہے اس کی تائید میں قرآن میں کوئی دلیل نہیں ہے

اس وجہ سے اس پر کسی گفتگو کی ضرورت نہیں ہے۔ باقی رہا پہلا اور تیسرا قول تو ان میں سے تیسرا قول ہمارے نزدیک زیادہ قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے وجوہ یہ ہیں:-

اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اسماء پر الف لام عہد کا ہے۔ اگر اس کو عہد کا الف لام مانا جائے تو پھر اس سے کچھ خاص ناموں ہی کا مراد لینا صحیح ہوگا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے ضمیریں اور اشارے وغیرہ جو استعمال ہوتے ہیں وہ تمام تر وہ ہیں جو عربی زبان میں عام چیزوں کے لیے نہیں بلکہ خاص طور پر عقل و ادراک اور شعور و ارادہ رکھنے والی چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً فرمایا ہے ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ (پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا) أَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِأَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ (مجھے ان لوگوں کے نام بتاؤ) يٰٓاٰدَمُ أَنْۢبِئْهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ (اے آدم ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کرو) فلما أَنْۢبَأَهُمْ بِأَسْمَآئِهِمْ (تو جب ان کو ان کے ناموں سے آگاہ کیا)

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں موقع فرشتوں کو قائل کرنے کا ہے۔ فرشتے حضرت آدمؑ کی ذریت کے متعلق یہ گمان رکھتے تھے کہ یہ خلافت پاکر زمین میں فساد مچائے گی اور خونریزیاں کرے گی۔ ان کے اس گمان کی تردید اگر ہو سکتی تھی تو اسی طرح ہو سکتی تھی کہ ان کو ذریت آدم کا مشاہدہ کرایا جائے اور اولاد آدم میں جو انبیاء و رسل، جو مجددین و مصلحین اور جو شہداء و صدیقین پیدا ہونے والے تھے ان سے ان کو آگاہ کیا جائے تاکہ ان پر یہ بات واضح ہو سکے کہ اگر اولاد آدم کے اندر ایسے لوگوں کے پیدا ہونے کا امکان ہے جو اللہ تعالیٰ کے تفویض کردہ اختیار کو بیجا طور پر استعمال کریں گے تو ساتھ ہی ان کے اندر ایسے لوگ بھی اٹھیں گے جو خود بھی اس ذمہ داری کا حق ادا کریں گے اور دوسروں کو بھی ان کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں گے۔

یہ تینوں باتیں بڑی اہمیت رکھنے والی ہیں۔ اگرچہ ان میں سے الگ الگ ہر ایک کے متعلق کوئی نہ کوئی کمزور قسم کا اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے لیکن یہ تینوں مجموعی طور پر مل کر نہایت مضبوط دلیل اس بات کی بن جاتی ہیں کہ اسماء سے مراد حضرت آدمؑ کی ذریت کے نام اور خاص کر ان لوگوں کے نام ہیں جو دنیا میں فساد کو مٹانے اور عدل کو قائم کرنے کے لیے آنے والے تھے۔

رہا یہ سوال کہ آدمؑ کی یہ ذریت تھی کہاں کہ ان کا مشاہدہ کرایا گیا اور ان کے نام بتائے گئے تو اس کا

جواب خود قرآن مجید سے معلوم ہو جاتا ہے۔ قرآن مجید میں تصریح موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام نسل آدم کو ایک مرتبہ نکال کر ان سے اپنے رب ہونے کا اقرار لیا ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا (۱۷۲، اعراف)

اور یاد کرو جب کہ تیرے رب نے تمام بنی آدم یعنی ان کی پیٹھوں سے ان کی ذریت کو نکالا اور ان کو خود ان کے اوپر گواہ بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انھوں نے اقرار کیا کہ ہاں ہم گواہ ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں بھیجنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے عالم غیب میں ایک مرتبہ تمام نسل آدم کے ایک اجتماع عام میں ان سے اپنی ربوبیت کا اقرار کرایا ہے۔ اسی اجتماع عام میں آدم کو ان کی ذریت کے نام بھی بتائے گئے ہوں گے اور اسی موقع پر فرشتوں کے سامنے ان کو پیش کرکے وہ سوال و جواب بھی ہوا ہوگا جس کا یہاں حوالہ ہے۔

انبئونی باسماء هٰؤلاء ان کنتم صادقین | یعنی اگر تم اس گمان میں سچے ہو کہ اولاد آدم خلافت پاکر زمین میں فساد برپا کرے گی تو ان لوگوں کے نام بتاؤ کہ یہ کون لوگ ہیں، یہ زمین میں فساد برپا کرنے والے ہیں یا اس میں امن اور عدل قائم کرنے والے ہیں؟ اس میں فرشتوں کو قائل کرنے والا پہلو یہ ہے کہ نسل آدم کے رویہ سے متعلق اگر کوئی رائے قائم کی جا سکتی ہے تو اسی شکل میں قائم کی جا سکتی ہے جب بحیثیت مجموعی ان کے بارے میں تمہیں واقفیت ہو لیکن جب اس طرح کی کوئی واقفیت تمہیں نہیں ہے تو پھر اس طرح کی بدگمانی کے لیے بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

قالوا سبحٰنک | قرآن مجید میں یہ کلمہ مختلف مواقع پر استعمال ہوا ہے۔

نامناسب اور خلاف شان باتوں سے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ کے لیے مثلاً سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (۶۸ قصص) (اللہ پاک اور برتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ خدا کا شریک ٹھہراتے ہیں)

دعاء کے موقع کے لیے مثلاً دَعْوٰىهُمْ فِيْهَا سُبْحٰنَكَ اللّٰهُمَّ (۱۰ یونس) ان کی دعا اس میں یہ ہوگی کہ تو پاک ہے اے اللہ۔

امر کے معنی کے لیے۔ مثلاً فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ (۱۷ روم) پس اللہ کی تسبیح کرو جس وقت تم شام کرتے ہو اور جس وقت تم صبح کرتے ہو۔

تعجب کے ساتھ کسی چیز کے انکار کے لیے۔ مثلاً سبحٰنک ھٰذا بہتان عظیم (۱۶۔ نور) (تو پاک ہے، یہ ایک بہت بڑا بہتان ہے)

یہاں یہ کلمہ اپنے پہلے مفہوم کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یعنی فرشتوں کا مطلب یہ تھا کہ تیری شان اس سے ارفع ہے کہ تیرے ہاتھوں کوئی ایسا کام ہو جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو، ہم نے جس شبہ کا اظہار کیا ہے وہ محض ہمارے علم کی کمی کا نتیجہ ہے، ہمارے پاس تو صرف اتنا ہی علم ہے جتنا تو نے ہمیں بخشا ہے۔ علم اور حکمت کا اصلی خزانہ تو صرف تیرے ہی پاس ہے۔

الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوٰت الایۃ | یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول کا حوالہ دیا ہے جو اوپر آیۃ ۳۰ میں گزر چکا ہے یعنی انی اعلم ما لا تعلمون (میں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو) پہلے یہ بات اجمال کے ساتھ کہی گئی تھی لیکن جب فرشتوں کو اچھی طرح قائل کر دیا گیا اور وہ قائل ہو بھی گئے تو پھر اسی بات کو مزید وضاحت کے ساتھ فرمایا تاکہ یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اس کارخانہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ساری حکمتیں اور مصلحتیں صرف اسی کو معلوم ہیں جس نے اس کارخانے کو بنایا ہے اور جو اس کو چلا رہا ہے، ان حکمتوں اور مصلحتوں کو فرشتے بھی، جو خدا سے اس قدر قرب رکھتے ہیں، نہ جانتے ہیں اور نہ خدا کے بتائے بغیر جان سکتے ہیں۔ اس وجہ سے قدرت کا کوئی فعل اگر بے حکمت و بے مصلحت نظر آئے تو اس کی بنا پر قدرت کو نشانۂ اعتراض یا خود اپنے آپ کو شکوک و شبہات کا مریض بنا لینے کے بجائے آدمی کو چاہیے کہ اس چیز کو اپنے علم کی کمی پر محمول کرے اور فرشتوں کی طرح سبحٰنک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم کا اقرار کرے کیونکہ خدائے علیم و حکیم کا کوئی فعل بھی حکمت اور مصلحت سے خالی نہیں ہے لیکن اس کے سارے کاموں کی حکمتوں اور مصلحتوں کو سمجھنا نہ فرشتوں کے لیے ممکن ہے، نہ جنوں کے لیے اور نہ انسانوں کے لیے۔

اس کے ساتھ یہ جو فرمایا کہ واعلم ما تبدون وما کنتم تکتمون (اور میں جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور جو تم چھپا رہے تھے) تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہارے سوال کو بھی سمجھتا تھا اور اس اصل وجہ کو بھی جانتا تھا جس سے یہ سوال پیدا ہوا تھا۔ وہ وجہ یہ تھی کہ تم آدم کی خلافت کی اسکیم کے مضمرات سے بے خبر تھے، تم چاہتے تھے کہ وہ تم پر ظاہر کیے جائیں، اس مقصد کے لیے تم نے اس اسکیم کے برے پہلوؤں کی طرف، جو واضح طور پر تمہیں نظر آئے، تم نے بشکل سوال اشارہ کیا تاکہ تم پر

اس کے وہ پہلو کھولے جائیں جو مخفی رہ گئے ہیں۔ چنانچہ آدم کی ذریت کا مشاہدہ کرا کے اور ان کے ناموں سے تعلیم دے کر

مُطالعہ حد...

مولانا عبدالغفار ح...

فضایل...

دعاء کے معانی | عربی...

میں ارشاد ہے:

کَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ...

دُعَآءً...

دوسری جگہ ارشاد...

لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّ...

بَعْضِکُمْ بَعْضًا...

•

اگر دعا ریا اس کے...

اور کسی چیز پر آمادہ کر...

رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ...

پ ۱۲ سورہ یو...

•

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر دعاء کا لفظ عبادت کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتاویٰ ابن تیمیہ ج ۲ ص ۲۵۴ - ارشاد ہے :۔

إِن يَدْعُونَ مِن دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا (۴ - ۱۱۷)

وہ اس کے سوا نہیں عبادت کرتے مگر مؤنث مخلوق کی

وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَدْعُونَ مِن قَبْلُ (۴۱ - ۴۸)

اور ان سے غائب ہو گیا جس کی وہ پہلے عبادت کرتے رہے ہیں۔

حافظ ابن القیم لکھتے ہیں کہ وہ تمام آیات جن میں مشرکین کی زبان سے اصنام اور معبودان باطل کے لیے دعاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس سے عبادت کا مفہوم مراد ہے جو ضمنی طور پر سوال اور فریاد کے معنی کو بھی شامل ہے۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو بدائع الفوائد ج ۳ ص ۱ تا ۱۸ التفسیر القیم ص ۲۲۴

دعاء کا لفظ سوال اور فریاد کے مفہوم میں بکثرت استعمال ہوا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے،

وَلَمْ أَكُن بِدُعَائِكَ رَبِّ شَقِيًّا (پ ۱۶ مریم آیت ۴)

اے رب! میں تجھ سے فریاد کرنے میں (کبھی) ناکام نہیں رہا ہوں۔

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ ، (پ ۱۵ بنی اسرائیل ۱۱۰)

کہہ دیجیے اللہ کے لفظ سے پکارو یا رحمان کے جس نام سے بھی (چاہو) اس کو پکارو، (کوئی حرج نہیں ہے) سب اچھے نام اسی کے لیے ہیں۔

زیر ترتیب مضمون میں یہی مفہوم مراد ہے،

دعا انسانی فطرت کا تقاضا ہے | انسان دنیاوی خوشحالی اور مادی ترقی کی بنا پر خواہ اپنے رب سے کتنا ہی دور ہو جائے اور غفلت و نسیان کے کتنے ہی دبیز پردے اس کے دل پر پڑ جائیں، بہرحال مصائب کے ہجوم میں بے ساختہ فریاد اور دعا کے لیے اس کے ہاتھ اٹھ ہی جاتے ہیں، قرآن حکیم نے اس فطری تقاضے کو کئی جگہ بیان کیا ہے۔ فرمایا :۔

وَإِذَا مَسَّ الْإِنسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَدْعُنَا إِلَىٰ ضُرٍّ مَّسَّهُ (پ ۱۱ سورہ یونس آیت ۱۲)

جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ کروٹ پر یا بیٹھے یا کھڑے (ہر حال میں) ہم کو پکارنے چلا جاتا ہے پھر جب ہم اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو ایسا (بے پرواہ ہو کر) چل دیتا ہے گویا اس تکلیف کے (دور کرنے کے) لیے جو اس کو پہنچ رہی تھی ہم کو (کبھی) اس نے پکارا ہی نہ تھا۔

☆

دوسری جگہ ارشاد ہے :

هُوَ الَّذِي يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا كُنتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا بِهَا جَاءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِينَ ۝ فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ پ ۱۱ سورہ یونس ع ۳ آیت (۲۲)

وہی خدا ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے (سفر کی سہولتیں مہیا کرتا ہے) یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ لوگوں کو خوشگوار ہوا کی مدد لے کر چلتی ہیں، اور لوگ ان کی رفتار سے خوش ہوتے ہیں کہ (ناگاہ) کشتی کو تیز تند ہوا کا جھونکا آلگتا ہے اور پانی کی لہریں ہر طرف سے چڑھ آتی ہیں اور وہ گمان کر بیٹھتے ہیں کہ اب تو (بری طرح) گھیرے میں آن پھنسے ہیں تو ایسے موقع پر خلوص دل سے خدا ہی کی بندگی کا اظہار کرتے ہوئے اس سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں (کہ اے پروردگار!) اگر تو ہم کو اس سے نجات دے تو ہم ضرور ہی تیرے شکرگزار ہوں گے، لیکن پھر جب وہ ان کو اس بلا سے نجات دے دیتا ہے تو وہ خشکی پر پہنچتے ہی ناحق طور پر سرکشی کرنے لگتے ہیں۔

☆

دعاء کی فضیلت و اہمیت | قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام اور اپنے دوسرے برگزیدہ بندوں کا نمایاں وصف یہ بیان فرمایا ہے کہ وہ اپنے رب کے حضور دعا کرتے ہیں، فرمایا :۔

يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا (سورۃ انبیاء پ ۱۷) وہ ہم کو رغبت اور خوف سے پکارتے ہیں۔

دعاء کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے، ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ (پ ۲۴ سورہ المومن آیت ۶۰) (مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا)

حدیث میں ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا الدعاء هو العبادة (مسند احمد، ترمذی)

دعا ہی عبادت ہے، دوسری حدیث میں ارشاد ہے، الدعاء مُخُّ العبادۃ (ترمذی) (دعا، عبادت کا مغز اور گودا ہے) ایک موقع پر آپ نے فرمایا الدعاء سلاحُ المومن (مستدرک حاکم) (دعا مومن کا ہتھیار ہے)

اور فرمایا لیس شیئٌ اکرم علی اللہ من الدعاء (ترمذی) (اللہ تعالیٰ کو دعا سے بڑھ کر کوئی چیز عزیز نہیں ہے)

ایک حدیث میں ہے مَنْ لَمْ یسئلِ اللہَ یَغْضَبْ عَلَیْہِ (ترمذی) (جو اللہ تعالیٰ سے سوال و دعا نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہوتا ہے)

کسی نے کیا خوب کہا ہے:

لاتسئل بنی آدم حاجۃ — واسئل الذی ابوابہ لا تحجب

اللہ یغضب ان ترکت سوالہ — وابن آدم حین یُسئل یغضب

یعنی انسان کے سامنے اپنی ضرورت کے لیے ہاتھ نہ پھیلاؤ، اس سے مانگو جس کے فضل و کرم کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے ہیں، اگر بندہ اپنے رب سے مانگنا چھوڑ دے تو وہ ناراض ہوتا ہے لیکن انسان کا معاملہ اس کے برعکس ہے، جب کوئی اس سے مانگتا ہے تو وہ غضبناک ہو جاتا ہے۔

روحِ دعا دعا کے لطف سے صحیح معنی میں انسان اسی وقت آشنا ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے اوپر وہی کیفیت طاری کر لے جسے شاہ ولی اللہؒ نے ان لفظوں میں بیان کیا ہے: (روح الدعاء ان یریٰ کل حول و قوۃ من اللہ و یصیر کالمیت فی ید الغسال و کالتمثال فی ید محرک التماثیل و یجد لذۃ المناجاۃ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ صفحہ) یعنی دعا کی روح یہ ہے کہ دعا کرنے والا ہر قوت و حرکت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھے، اور اس کی قدرت و عظمت کے مقابلہ میں اپنے آپ کو اسی طرح بے کس اور بے بس سمجھے جس طرح مردہ غسال کے ہاتھوں میں، یا بے جان صورتیں، حرکت دینے والے کے قبضے میں (مجبور محض) ہوتی ہیں۔ اور پھر اس کیفیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مناجات اور سرگوشی کی لذت اُسے حاصل ہو۔

دعاء کے آداب و شرائط لیکن روحِ دعاء کی یہ کیفیت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ قبولیتِ دعاء کے ان شرائط و آداب کو ملحوظ رکھا جائے جو قرآن و سنت میں وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔

اس کی مثال ظاہری جسمانی علاج کی طرح ہے، بیمار دوا کے ذریعہ شفایاب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ ان شرائط و ہدایات کو ملحوظ رکھے جو معالج نے بتائی ہیں، اور ان چیزوں سے پرہیز کرے جن سے بچنے کا اس نے حکم دیا ہے، محض دوا کا استعمال ہی کافی نہیں ہے۔ یہی حال اس روحانی علاج کا ہے۔ قرآن و حدیث کی دعائیں باطنی اور ظاہری امراض کے لیے اسی وقت مفید ہو سکتی ہیں جب کہ ان کے اثر کو قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد بھی مریض میں موجود ہو، اور پرہیز و احتیاط کے ان تمام تقاضوں کو بھی پورا کرے جو اس راہ میں ناگزیر ہیں۔

قبولیتِ دعاء کے شرائط (۱) اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات پر ایمانِ کامل، قرآن حکیم میں ارشاد ہے:-

وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَۃَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّھُمْ یَرْشُدُوْنَ۔

پ ۲ سورہ بقرہ آیت (۱۸۶)

اور (اے پیغمبر) جب میرے بندے میرے بارے میں تم سے دریافت کریں تو (ان کو سمجھا دو کہ) میں ان سے قریب ہوں، میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے تو چاہیے کہ وہ میرا بات مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ ہدایت پائیں۔

(۲) داعی کا دل اخلاص، انابت، حضورِ قلب اور سوزِ یقین سے معمور ہو۔ قرآن میں ارشاد ہے:-

فَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ (سورہ اعراف ۲۹)

عبادت کو اسی کے لیے خالص کرتے ہوئے، دعا کرو۔

حدیث میں ہے:

ادعوا اللہ وانتم موقنون بالاجابۃ واعلموا ان اللہ لا یستجیب دعاءً من قلب غافلٍ لاہٍ

(ترمذی)

اللہ تعالیٰ کی طرف سے قبولیت کا یقین رکھتے ہوئے اس سے دعا کرو، اور یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ غافل بے پروا دل کی دعا کو شرفِ قبولیت نہیں بخشتا۔

(۳) کسبِ حلال کا اہتمام کیا جائے، حرام کمائی کے ساتھ دعا بارگاہِ الٰہی میں مقبول نہیں ہوتی؛ حدیث میں ہے:

یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیہ الی السماء یارب یارب ومطعمہ حرام ومشربہ حرام وملبسہ حرام وغذی

انسان دور دراز مقام کا سفر کرتا ہے، پراگندہ حال غبار آلود صورت میں اپنے ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے کہتا ہے۔ اے رب! اے رب! حالانکہ

بالحرام فانی یستجاب لذالك

مشکوٰۃ ص۲۴۱ بحوالہ صحیح مسلم

اس کا کھانا حرام ہے، پینا حرام ہے، لباس حرام ہے اور اس کے گوشت پوست کی پرورش حرام مال سے ہوئی ہے تو ایسی حالت میں دعا کیسے قبول ہو۔

☆

اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کو کسب حلال کا حکم دیا ہے، فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَاعْمَلُوا صَالِحًا ۔ پ۱۸ سورہ مومنون آیت (۵۲)

اے رسولو! پاکیزہ رزق کھاؤ اور نیک اعمال کرو

•

مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۔ پ۲ سورہ بقرہ آیت (۱۷۲)

اے ایمان والو! جو ہم نے تمہیں پاکیزہ رزق دیا ہے اس میں سے کھاؤ۔

(۴) کبائر سے پرہیز، مثلاً مکر و فریب، غیبت، چغلی، حسد، تکبر، کینہ سے اپنے نفس کو پاک رکھے۔ اس قسم کے روحانی اور اخلاقی امراض کے ہوتے ہوئے یہ ناممکن ہے کہ دعاء بارگاہ خداوندی میں پہنچنے کے لیے بلند مدارج طے کر سکے، جیسا کہ ارشاد ہے:۔

إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ (پ۲۲ سورہ فاطر آیت ۱۰)

اسی کی طرف پاکیزہ کلمات چڑھتے ہیں اور نیک اعمال کے ذریعے بلند مدارج طے کرتے ہیں۔

یعنی عمل صالح کے ذریعہ پاک کلمات خدا کے ہاں مقبولیت کا درجہ حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر نیک اعمال کو وسیلہ بنا کر دعا کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے، جیسا کہ غار والی حدیث سے معلوم ہوتا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ تین شخص کہیں جاتے ہوئے باد و باراں کے طوفان میں گھر گئے، انھوں نے ایک غار میں پناہ لی۔ اتفاق سے ایک چٹان لڑھک کر غار کے دہانے پر گر پڑی اور باہر نکلنے کا راستہ بند ہو گیا، اس موقع پر ہر ایک نے اپنی دعاء میں اپنے سابقہ نیک عمل کو پیش کر کے اس قید سے نجات حاصل کی۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو صحیح بخاری، مشکوٰۃ، باب الرحمۃ والشفقۃ علی الخلق ج ۲ ص۴۲۱ - ظاہر ہے کہ جب نیک عمل دعاء کی قبولیت کا سبب بنتی ہے تو بدعملی اس راہ کی رکاوٹ بنے گی۔

دعاء کے باطنی اور ظاہری آداب

قرآن مجید میں دعاء کے آداب کی طرف مندرجہ ذیل آیت میں رہنمائی

کی گئی ہے۔

ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۔ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ، وَادْعُوهُ خَوْفًا وَطَمَعًا إِنَّ رَحْمَتَ اللَّهِ قَرِيبٌ مِنَ الْمُحْسِنِينَ

(سورہ اعراف آیت ۵۶)

اپنے رب کو عاجزی کے ساتھ گڑگڑاتے ہوئے پوشیدہ پکارو، بلاشبہ وہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا، زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا مت کرو اور اسے خوف و طمع (دونوں قسم کے ملے جلے جذبات) کے ساتھ پکارو، بے شک اللہ کی رحمت محسنوں سے قریب ہے۔

•

اس آیت میں صراحۃً اور اشارۃً دعاء کے چھ آداب بیان کیے گئے ہیں۔

(۱) دعاء کے وقت تضرع، خشوع اور عاجزی و انکساری انسان کی ہر ہر حرکت اور ادا سے نمایاں ہو، اس کا دل اپنے رب کی عظمت و جلال سے پوری طرح بھرپور ہو۔

(۲) اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کی توقع اور اس کے عذاب کے اندیشے سے ملے جلے جذبات دل میں امید و بیم کی ایک اضطرابی کیفیت پیدا کیے ہوئے ہوں۔

اسی خصوصیت کو دوسری آیات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ ، سورۃ الانبیاء آیت (۹۰)

بیشک وہ (انبیاء کرام) نیکیوں میں سبقت کرتے تھے اور ہم کو رغبت و خوف کے ساتھ پکارتے تھے اور وہ ہمارے سامنے عاجزی کرنے والے تھے۔

تَتَجَافَى جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا (پ۲۱ سورہ سجدہ آیت ۱۶)

ان کے پہلو خوابگاہوں سے الگ ہو جاتے ہیں۔ وہ ڈرتے ہوئے، امید رکھتے ہوئے اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

•

قرآن مجید میں مومنین صالحین کی صفات میں خوف اور طمع دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا گیا ہے، کیونکہ ان دونوں کی یکجائی ہی سے انسان میں توازن اور اعتدال پیدا ہو سکتا ہے، اگر انسان کے سامنے صرف اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت اور فضل و کرم ہی کا تصور ہو تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ سراپا امید بن کر گناہوں پر دلیر نہ ہو جائے اور اگر عذاب ہی کا نقشہ پیش نظر رہے تو مایوسی اور

قوتِ عمل کے تعطل کا قوی اندیشہ ہے۔

حافظ ابن قیمؒ نے اس حقیقت کو ایک لطیف مثال کے ذریعہ واضح کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:-

"یوں سمجھنا چاہیے کہ اس دنیا کے سفر میں خوف بمنزلہ کوڑے اور تازیانے کے ہے، اور امید حدی خوانی کی حیثیت رکھتی ہے، اس سے سفر کی مشقتیں بآسانی برداشت ہو سکتی ہیں، محبت رہنما کے درجہ میں ہے جو سواری کی نکیل تھامے ہوئے ہے، اگر سوار کے پاس سواری کو قابو میں رکھنے کے لیے کوڑا نہ ہو تو سیدھی راہ سے ہٹ جانے اور پگڈنڈیوں میں بھٹک جانے کا قوی امکان ہے، اس خوف کے تازیانے کے بغیر حدود الٰہیہ کی حفاظت ناممکن اور گمراہی یقینی ہے، خوف و رجا اور محبت سے جو دل بھی خالی ہوگا اس کی اصلاح کی کبھی بھی توقع نہیں کی جا سکتی، اور جس قدر یہ صفات کمزور ہوں گی اسی لحاظ سے ایمان میں بھی ضعف نمایاں ہوگا۔" بدائع الفوائد ج ۳ ص ۱۵

(۳) دعاء میں جہاں تک ہو سکے اخفاء سے کام لیا جائے یعنی چپ چپاتے اور آہستگی سے اپنے رب کے حضور سرگوشی اور مناجات کی جائے۔ دعاء کا اصل ادب یہی ہے۔ الا یہ کہ کسی موقع پر خود شارع ہی نے بلند آواز سے دعا کرنے کا حکم دیا ہو۔

حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ سری اور جہری دعاء کے درمیان ستر گنا فرق ہے۔ بدائع الفوائد ج ۳ ص ۱۰

حضرت زکریا علیہ السلام کی سری دعاء کو اللہ تعالیٰ نے مقام مدح میں ذکر فرمایا ہے:-

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا (پ ۱۶ سورہ مریم آیت ۳) جب اس نے اپنے رب کو پوشیدہ طور پر چپ چپاتے پکارا۔

سری دعاء کے فوائد و منافع بجائے خود نہایت اہم اور اثر انگیز ہیں:-

(الف) دعا کا یہ طریقہ ایمان و یقین کی پختگی کو بتلاتا ہے، کیونکہ داعی یہ ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی سرگوشیوں کو بھی سنتا ہے، اس کا حال اس شخص کا سا نہیں ہوتا جو یہ خیال کرتا ہے کہ اگر ہم بلند آواز سے دعا کریں تو اللہ تعالیٰ سنتا ہے ورنہ نہیں۔

(ب) ادب و تعظیم کے لحاظ سے بھی یہی طریقہ موزوں ہے، دنیا میں بادشاہوں اور حاکموں کے درباروں میں گفتگو کرتے ہوئے ضرورت سے زیادہ آواز بلند کرنا گستاخی اور خلاف ادب قرار دیا

جاتا ہے۔ پھر وہ خدا جو ہلکی سے ہلکی آواز بھی سُن لیتا ہے، اس کے حضور میں تو سری دعاء اور زیادہ مناسب ہے۔

(ج) یہ صورت خشوع خضوع اور گریہ وزاری کے لحاظ سے بھی زیادہ موزوں ہے، یہ ادا دعا کی روح اور مغز ہے، ایسے موقع پر دعا کرنے والے کا حال اس عاجز و مسکین کا سا ہوتا ہے جس کا دل ٹوٹ چکا ہے، اعضاء ڈھیلے پڑ چکے ہیں، آواز پست ہو گئی ہے، یہاں تک کہ عاجزی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ زبان کو گویائی کی تاب نہیں ہے۔ اب حال یہ ہے کہ دل آہ و زاری کے ساتھ دعاء و مناجات میں مشغول ہے اور زبان انتہائی عاجزی اور مسکینی کی بنا پر خاموش ہے، یہ رقت انگیز منظر آواز بلند کرنے کی صورت میں حاصل نہیں ہو سکتا۔

(د) اس شکل میں ریاکاری اور نمائش پسندی کے بجائے اخلاص کا پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔

(ہ) پوری یکسوئی اور دلجمعی کے ساتھ بندہ اپنے رب سے راز و نیاز کا موقع پاتا ہے، بلند آواز سے یکسوئی اور جمعیتِ خاطر پراگندہ ہو جاتی ہے۔ جس قدر آواز پست ہوگی اسی قدر خدا سے لگاؤ و تعلق میں اضافہ ہوگا۔

(و) پست آوازی میں ایک لطیف نکتہ یہ بھی ہے کہ بندہ اپنے رب سے زیادہ قریب معلوم ہوتا ہے گویا وہ اس طرح سرگوشی کر رہا ہے جس طرح ایک قریبی دوست اپنے دوست سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریاؑ کی سری دعا کی مدح فرمائی ہے۔

بندہ جس قدر حضورِ قلب کے ساتھ خدا کو پکارے گا اسی لحاظ سے اس کو اپنے رب کا قرب حاصل ہوگا، اور جب یہ تصور دل میں جم جائے گا کہ وہ ہر قریب سے بھی زیادہ قریب ہے تو نہایت راز سے اپنی درخواست اس کی بارگاہ میں پیش کرے گا۔ ایسے موقع پر بلند آوازی پسندیدہ نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اگر ہمنشین ساتھی آہستہ گفتگو سن لیتا ہے تو ایسی صورت میں بلند آواز سے چیخنا چلانا عام طور پر معیوب ہی سمجھا جائے گا۔

اس امر کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے، صحابہؓ نے ایک سفر میں بلند آواز سے تکبیریں شروع کر دی تھیں تو آپ نے ارشاد فرمایا اربعوا علی انفسکم، اپنے اوپر رحم کرو، تم کسی بہرے یا غائب کو نہیں پکار رہے ہو، تم ایسی ہستی کو پکار رہے ہو جو سننے والی اور تم سے انتہائی قریب ہے

جتنی سواری کی گردن تم سے قریب ہے اس سے کہیں زیادہ وہ تم سے قریب ہے۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے، وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے دریافت کیا، کہ ہمارا خدا ہم سے قریب ہے کہ اس سے سرگوشی کریں یا دور ہے کہ زور سے اور بلند آواز سے پکاریں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مندرجہ بالا سوال و جواب سے یہ واضح ہوا کہ سری دعاء اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ پسند ہے۔

(ز) سری دعاء کی شکل میں سوال و طلب کا سلسلہ عرصہ دراز تک جاری رہ سکتا ہے۔ نہ زبان تھکتی ہے اور نہ اعضاء پر بوجھ پڑتا ہے، جہر (بلند آوازی) کی صورت میں زبان اور اعضاء جلد ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔

(ح) پست آوازی کی شکل میں شیطانی وساوس، موانع اور رکاوٹوں سے محفوظ رہ سکتا ہے کیونکہ اس طرح پر ارواحِ خبیثہ اور شیاطین انس و جن اس کے طرزِ عمل سے بے خبر رہیں گے اور اپنے فتنے پھیلانے کے مواقع نہ پاسکیں گے، جن لوگوں کو اس بات کا تجربہ ہے وہ اس فائدے سے انکار نہیں کرسکتے۔

(ط) خدا کی سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ بندہ اپنے رب کی طرف کامل یکسوئی اور پوری توجہ کے مواقع حاصل کرسکے، اس نعمت سے بڑھ کر دوسری نعمت اور کیا ہوسکتی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ کوئی نعمت، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، حاسدوں کی نگاہ سے نہیں بچ سکتی پھر اس اعلیٰ نعمت پر حاسدین کا پیدا ہوجانا بعید از قیاس نہیں ہے، ایسی صورت میں حاسد کی شرربار نگاہوں سے بچنے کی شکل یہی ہوسکتی ہے کہ اس نعمت کو پوشیدہ رکھا جائے۔ اس کا چرچا نہ کیا جائے۔

اسی بنا پر یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام سے فرمایا تھا:

لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ كَيْدًا (پ ۱۲ سورہ یوسف)	اپنا خواب اپنے بھائیوں سے نہ کہنا ورنہ وہ کوئی چال چلیں گے۔

کتنے ہی ایسے صاحب دل پارسا گذرے ہیں جو اپنی اس نعمت کو ظاہر کرکے اطمینان قلب کی نعمت سے محروم ہوگئے۔ اسی لیے اس راہ کے سالک کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق، اور مناجات کے نتیجے میں جو احوال و کیفیات محسوس ہوں ان کو پوشیدہ ہی رکھا جائے، خصوصاً اس

راہ کے مبتدی کے لیے تو یہ پابندی نہایت ہی ضروری ہے۔ ہاں جن لوگوں میں یہ ربانی کیفیات اور روحانی احوال پوری طرح راسخ ہوجائیں اور ان کو تیز و تند ہواؤں سے اس پاکیزہ درخت کی مضبوط جڑوں کے اکھڑنے کا اندیشہ نہ رہے تو پھر عوام کی اتباع اور پیروی کے لیے اس حالت کے ظاہر کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ دعا، طلب، ثنا، محبت، انابت اور توجہ الی اللہ جیسے عظیم القدر خزانوں پر مشتمل ہوتی ہے، اس لیے اخفاء کا پہلو ہی زیادہ غالب رہنا چاہیے۔

(ی) دعاء کو ذکر بھی کہتے ہیں، اس میں طلب و سوال کے ساتھ حمد و ثنا بھی ہوتی ہے، ربانی اوصاف و اسماء کا بیان بھی ہوتا ہے، اسی طرح ذکر کو دعاء بھی کہا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے افضل الدعاء الحمد للہ، یعنی بہترین دعا الحمد للہ ہے۔ الحمد للہ محض حمد ہے۔ بظاہر اس میں طلب و سوال کی کوئی آمیزش نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن اس کو دعا اس لیے کہا گیا کہ یہ معنوی طور پر محبت اور ثناء کو شامل ہے اور محبت، طلب محبوب کی بلند ترین انواع میں سے ہے۔ بلکہ طالب حاجت سائل کی بہ نسبت حامد اور ذاکر زیادہ اس بات کا حقدار ہے کہ اس کو داعی (صاحب دعا) قرار دیا جائے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ دعا اور ذکر دونوں ایک دوسرے کو شامل ہیں اور ذکر کے آداب میں واضح طور پر ارشاد ربانی ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ (پ ۹ سورہ اعراف آیت ۲۰۵)	یعنی اپنے رب کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور ڈر کر بغیر آواز بلند کیے یاد کرو۔

(۴) دعا کا چوتھا ادب یہ ہے کہ دعا مانگنے میں حد سے تجاوز نہ کیا جائے یہ ادب قرآن کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ۔ اس اعتداء (حد سے بڑھنے) کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) دعاء میں ایسی چیزیں طلب کرنا جن کا داعی اہل نہیں ہے مثلاً انبیاء کرام کے درجات و مراتب مانگنا۔

(ب) ابو داؤد کی روایت ہے کہ عبداللہ بن مغفل نے اپنے بیٹے کو کہتے ہوئے سُنا کہ "اے خدا میں تجھ سے جنت کے دائیں جانب سفید محل کا طالب ہوں" عبداللہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے بچے! بس اللہ تعالیٰ سے جنت طلب کرو اور جہنم سے پناہ مانگو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میری امت میں

ایسے لوگ ہوں گے، جو طہارت اور دعاء میں حد سے بڑھ جائیں گے۔

(ج) حرام کاموں پر نصرت کی طلب۔

(د) اللہ تعالیٰ سے ایسی آرزو کرنا جو وہ پوری نہیں کرتا، مثلاً قیامت تک کی زندگی یا بشری ضروریات کھانے پینے سے بے نیازی حاصل ہوجانا، یا یہ سوال کر بلا شادی بیاہ کے اولاد حاصل ہوجائے، اس قسم کے تمام سوالات جو اللہ تعالیٰ کی حکمت، شریعت اور اس کے بنائے ہوئے قوانینِ فطرت کے خلاف ہوں، اعتداء (حد سے بڑھنے) میں شمار ہوں گے۔

(ہ) ابن جریجؒ کا قول ہے کہ چلا چلا کر دعا کرنا بھی اعتداء میں داخل ہے۔

(و) سب سے بڑا اور خطرناک "اعتداء" یہ ہے کہ بندہ دعاء و عبادت میں غیر خدا کو بھی شریک کرلے، اور ان سے اسی طرح مدد طلب کرے جس طرح خدا سے طلب کی جاتی ہے۔

(ز) دعاء میں تضرع اور عاجزی کے بجائے بے پروائی یا شانِ تغافل کا اظہار کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس طرح بابِ اجابت و قبولیت نہیں کھلتا، بلکہ انسان رحمت خداوندی سے دور سے دور تر ہوتا جاتا ہے۔

(ح) دعاء یا عبادت میں ایسے طریقے اختیار کرنا جو شریعت سے ثابت نہیں ہیں۔

(ط) دعا میں بہ تکلف سجع (قافیہ بندی) کا اہتمام بھی اعتداء کی ایک شکل ہے۔ ہاں اگر بلا تکلف موزوں کلمات زبان پر جاری ہوجائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے فرمایا انظر السجع من الدعاء فاجتنبه۔ دعاء میں قافیہ بندی سے پرہیز کرو، صحابۂ کرام کا یہ طرزِ عمل نہ تھا، صحیح بخاری، مستدرک حاکم۔ احیاء العلوم غزالیؒ ج ا ص ۳۱۲

(۵) مذکورہ بالا آیات میں ذکر و دعاء کے آداب بتلاتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:-

لَا تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا — زمین میں اصلاح اور درستگی کے بعد فساد اور بگاڑ نہ پیدا کرو۔

•

آیت کے سیاق و سباق سے یہ لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ مُفسدین فی الارض کی دعاء بارگاہ خداوندی میں شرفِ قبولیت حاصل نہیں کرسکتی۔ فساد فی الارض (اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی اور غیر اللہ کی طرف دعوت) اس راہ کی بہت بڑی رکاوٹ ہے اس کے ہوتے ہوئے نہ دعاء و مناجات میں لطف و سکون حاصل ہوسکتا ہے اور نہ حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے انسان ہم کنار ہوسکتا ہے۔

(۶) آداب دعاء بتلاتے ہوئے آخر میں یہ بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ:-

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ — بلا شبہ اللہ تعالیٰ کی رحمت صاحب احسان افراد سے بہت ہی قریب ہے۔

•

احسان کی تعریف حدیث میں اس طرح آئی ہے:-

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ — اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا کہ تم اُسے دیکھ رہے ہو۔ (یہ بھی حقیقت ہے کہ) اگر تم اُسے نہیں دیکھ سکتے تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

•

دعاء کے وقت اگر احسان کی یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو رب العٰلمین سے سرگوشی کی حقیقی لذت حاصل نہیں ہوسکتی۔ دعاء کا لطف اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی عظمت، خوف، محبت اور ہیبت و جلال دل پر چھا جائے اور ایسا محسوس ہو کہ بندہ اپنے رب کے حضور آمنے سامنے ہو کر عرض معروض کر رہا ہے۔

لیکن یہ صفت احسان اسی وقت پیدا ہوسکتی ہے جب کہ انسان اخلاص اور اتباع شریعت دونوں کو اپنی زندگی کے ہر عمل میں جاری و ساری کرلے۔

(۷) ان اوقات و احوال میں دعاء مانگنے کا خاص طور پر اہتمام کیا جائے جن میں دعاء کے مقبول ہونے کی تصریح احادیث میں مذکور ہے (ان احوال و اوقات کی تفصیل آئندہ صفحات میں بیان ہوگی انشاء اللہ)

(۸) دل میں یہ خیال نہ پیدا ہو کہ دعا کرتے کرتے تھک گیا ہوں لیکن دعاء ہے کہ کسی طرح قبول ہونے ہی میں نہیں آتی، اس قسم کے گلے، شکوے کی پرچھائیں بھی دل پر نہیں پڑنی چاہیے۔

حدیث میں ہے، آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یستجاب لاحدکم مالم یعجل، فیقول قد دعوتُ فلم یُستجب لی — تم میں سے کسی کی دعا اس وقت قبول ہوتی ہے، جب کہ وہ جلد بازی سے کام نہ لے۔ دعا کرنے والا کہتا ہے میں نے دعا کی لیکن وہ قبول ہی نہیں ہوتی۔

•

ایک دوسری روایت میں دعاء کی قبولیت کے اثرات تین قسم کے بتلائے گئے ہیں:-

مَا مِنْ مُسْلِمٍ یَدْعُو بِدَعْوَۃٍ لَیْسَ فِیْھَا اِثْمٌ وَلَا قَطِیْعَۃُ رَحِمٍ اِلَّا اَعْطَاہُ اللہُ بِھَا اِحْدٰی ثَلٰثٍ، اِمَّا اَنْ یُّعَجِّلَ لَہٗ دَعْوَتَہٗ وَاِمَّا اَنْ یَّدَّخِرَھَا لَہٗ فِی الْاٰخِرَۃِ وَاِمَّا اَنْ یَّصْرِفَ عَنْہُ مِنَ السُّوْءِ مِثْلَھَا، قَالُوْا اِذًا نُکْثِرُ قَالَ اللہُ اَکْثَرُ

(مسند احمد)

مسلمان کی دعا قبولیت کے لحاظ سے تین حال سے خالی نہیں ہے، بشرطیکہ دعا میں کوئی ایسی چیز نہ طلب طلب کی جائے جو گناہ یا قطع رحمی کی موجب ہو، (۱) اللہ تعالیٰ دنیا ہی میں بندے کو وہ کچھ عنایت فرما دیتا ہے جس کا وہ آرزومند ہے (۲) دعا کو آخرت کے لیے ذخیرہ بنا دیتا ہے۔ (۳) مطلوبہ بھلائی کے ہم قیمت کسی برائی یا تکلیف کو اس سے دور فرما دیتا ہے، اس پر صحابہ کرام نے عرض کیا تب تو ہم خوب کثرت سے دعا کریں گے۔ آپ نے ارشاد فرمایا، اللہ تعالیٰ کے خزانوں میں کونسی کمی ہے، اس کا فضل و کرم بھی بے شمار ہے۔

☆

(۹) فراخی ہو یا تنگدستی ہر حال میں اپنے رب سے دعا اور طلب کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔

یہ انتہائی خود غرضی کی نشانی ہے کہ مصیبت اور پریشان حالی میں تو خدا کو پکارا جائے، لیکن جب راحت و آرام اور خوشحالی حاصل ہو جائے تو خدا کو بھول کر دنیا کی آسائشوں اور تفریحات میں انسان گم ہو جائے، یہ کردار تو قرآن نے کفار و مشرکین کا بیان کیا ہے۔

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّہٗ مُنِیْبًا اِلَیْہِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَہٗ نِعْمَۃً مِّنْہُ نَسِیَ مَا کَانَ یَدْعُوْٓا اِلَیْہِ مِنْ قَبْلُ

(پ ۲۳ سورہ زمر، ع ۵)

اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے پروردگار کی طرف رجوع ہو کر اس کو پکارتا ہے پھر جب خدا اس کو اپنی طرف سے نعمت عطا فرما دیتا ہے، تو جس (غرض) کے لیے اس نے پہلے (خدا کو) پکارا تھا، اس کو بھلا دیتا ہے۔

اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یَّسْتَجِیْبَ اللہُ لَہٗ عِنْدَ الشَّدَائِدِ فَلْیُکْثِرِ الدُّعَاءَ فِی الرَّخَاءِ

(ترمذی)

جس شخص کو یہ بات بھلی معلوم ہوتی ہے کہ شدائد و مصائب میں اللہ تعالیٰ اس کی دعا اور فریاد سنے تو اُسے چاہیے کہ راحت اور فارغ البالی کے زمانہ میں بھی خدا کو خوب یاد رکھے اور اس سے دعا مانگنے میں کوئی کوتاہی نہ کرے۔

(باقی آئندہ)

تزکیہ نفس

امین احسن اصلاحی

تعلق باللہ کی اساسات

[اس تمہید کے بعد اب ایک مناسب ترتیب کے ساتھ میں ان اساسات کو واضح کرنے کی کوشش کروں گا جن پر اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا ہے کہ ہمارا تعلق اس کے ساتھ قائم ہو اور جن پر ہم اپنا تعلق اس کے ساتھ قائم کر کے اپنے آپ کو اس کی صفات کے تقاضوں کے مطابق بنا سکتے ہیں

شکر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارے تعلق کی سب سے پہلی بنیاد شکر ہے۔ شکر کا تعلق دل سے بھی ہے، زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی ہے۔ دل کا شکر یہ ہے کہ آدمی کا دل اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں اس کے بے نہایت احسانات اور اس کے ان گنت انعامات کے احساس و اعتراف کے جذبہ سے اسی طرح لبریز رہے جس طرح ایک دودھاری بکری کا تھن دودھ سے لبریز رہتا ہے۔ یہ تمثیل میں نے محض تمثیل ہی کے مقصد سے نہیں اختیار کی ہے بلکہ لفظ شکر کی لغوی حقیقت بھی کچھ اسی سے ملتی جلتی ہے۔ دل جب اللہ تعالیٰ کی احسان مندی کے جذبات سے لبریز رہتا ہے تو جس طرح ذرا سی حرکت سے ایک لبریز ساغر چھلک جایا کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ہر چھوٹی یا بڑی نعمت کی یاد اور اس کے مشاہدہ سے بندے کی زبان سے شکر کا کوئی کلمہ چھلک پڑتا ہے۔

جس شخص کا دل اس طرح خدا کی احسانمندی کے جذبات سے لبریز رہے اس کا اثر لازمی طور پر اس کے اعمال پر بھی پڑتا ہے۔ اس کو ہر وہ عمل دل سے محبوب ہو جاتا ہے جس سے اس کے اس جذبے کو تسکین حاصل ہو سکے۔ اور اس کے برعکس اس کو ہر اس عمل سے نفرت ہو جاتی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی کسی

ظاہری یا باطنی نعمت کی ناقدری ہو رہی ہو۔ کسی نعمت کی قدر کا حقیقی احساس اگر آدمی کے اندر موجود ہو تو وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہو سکتا کہ وہ اس نعمت کو اپنے حقیقی منعم ہی کے منشا کے خلاف استعمال کرے۔ اگر ایک کرم فرما ہمیں ایک ٹارچ عنایت کرے کہ ہم اس کی مدد سے اندھیرے کی ٹھوکروں سے بچ سکیں، ایک تلوار عنایت کرے کہ دشمن کے خطرات کی مدافعت کر سکیں، ایک سواری عنایت کرے کہ اس کی مدد سے ہم پیادہ روی کی مشقت سے بچ سکیں تو کوئی انتہائی درجے کا کمینہ اور لئیم ہی ہوگا جو ان سارے اسباب و وسایل کو اسی کرم فرما کے گھر پر حملہ اور اسی کے زن و فرزند کو قتل کرنے میں استعمال کرے جس نے یہ اسباب و اسلحہ اس کو عنایت فرمائے۔ اسی طرح جس بندے کے اندر ان نعمتوں کا سچا احساس ہوتا ہے جو خدا نے اس کو عنایت کی ہیں، وہ اس بات پر کبھی راضی نہیں ہوتا کہ ان نعمتوں کو وہ شیطان کی مقصد براری میں صرف کرے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت عائشہ رضی نے اپنے اس خط میں اشارہ فرمایا ہے جو امیر معاویہ رضی کو لکھا ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ "جس شخص پر انعام ہوا ہو اس کے اوپر کم سے کم جو ذمہ داری عاید ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اس انعام کو اسی کی نافرمانی کا ذریعہ نہ بنائے جس نے وہ انعام اس پر کیا ہے"۔

اس شکر کے جذبے کو صحیح طور پر بیدار رکھنے کے لیے چند باتیں نہایت ضروری ہیں۔

پہلی چیز تو یہ ہے کہ آدمی کو اس کے ظاہر اور باطن میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ملی ہوئی ہیں ان کو برابر نگاہ میں رکھنے کی کوشش کرے۔ انسان کے اندر یہ بڑی کمزوری ہے کہ اگر وہ کسی تکلیف میں مبتلا ہو جائے تو وہ تو اس کے ذہن پر چوبیس گھنٹے مسلط رہتی ہے اور ہر کسی سے اس کا ذکر کرتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں جو اس کو ہر وقت حاصل رہیں ان سے وہ اس طرح غافل اور بے پروا رہتا ہے گویا ان کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے۔ اگر آدمی کو نعمتوں کے نعمت ہونے اور ان نعمتوں سے بہرہ یاب ہونے کا کوئی احساس ہی نہ ہو تو وہ منعم کی قدر کیا کرے گا، اور اس کے لیے اس کے اندر شکر و سپاس کا جذبہ کیا پیدا ہوگا۔ اس غفلت کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی روزانہ کوئی نہ کوئی وقت تھوڑا سا ایسا ضرور نکالے جس میں ان نعمتوں پر غور کرے جو اس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے ظاہر و باطن دونوں میں بخشی ہیں بلکہ ان کے مظاہر اس کائنات کے گوشے گوشے اور چپے چپے میں پھیلے ہوئے ہیں۔

تنہائی میں کبھی کبھی غور کرتے کرتے وہ اس پہلو سے بھی سوچے کہ بالفرض یہ نعمتیں اس کو نہ حاصل ہوتیں

تو کیا ہوتا؟ یہ آنکھ جس سے وہ دیکھتا ہے اس سے وہ محروم ہوتا، یہ کان جس سے وہ سنتا ہے یہ بہرے ہوتے، یہ ہاتھ جن سے وہ زور آزمائی کرتا ہے شل ہوتے، یہ پاؤں جن سے وہ چلتا ہے مفلوج ہوتے تو اس کا حشر کیا ہوتا؟ اور پھر سب سے زیادہ وہ اس بات پر دھیان کرے کہ یہ دماغ جس کی کارفرمائیوں پر وہ سب سے زیادہ نازاں ہے، خدانخواستہ یہ ماؤف ہوتا تو اس کی گت کیا بنتی؟

دوسری ضروری بات یہ ہے کہ آدمی اس امر پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے جو نعمتیں ہمیں بخشی ہیں بلا کسی استحقاق کے بخشی ہیں۔ نہ ہمارا خدا پر کوئی حق قائم تھا، نہ ہم نے کسی نعمت کا اس کو معاوضہ ادا کیا ہے اور نہ کسی نعمت کا معاوضہ ادا کر سکتے ہیں۔ پھر وہ جب چاہے اپنی ہر نعمت کو ہم سے چھین لے سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا۔ آج آپ کو تخت شاہی کی عظمتیں حاصل ہیں، کل وہ آپ کے ہاتھ میں کاسۂ گدائی پکڑا دے تو آپ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ اس وجہ سے کسی بھی ذلت و مصیبت میں پڑے ہوئے آدمی کو نظر انداز کرتے ہوئے گذر جانے کی کوشش نہ کیجیے بلکہ اس پر غور کیجیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسی حالت میں آپ کو مبتلا کر دیتا یا آیندہ کر دے تو آپ کو اس چیز سے کون بچا سکتا یا کون بچا سکے گا۔ دنیا میں مصیبت زدہ سے مصیبت زدہ اور مفلوک سے مفلوک آدمی جو آپ نے دیکھا ہو یاد رکھیے کہ اللہ تعالیٰ ٹھیک اس کی جگہ پر آپ کو کھڑا کر سکتا تھا اور اس کو آپ کی جگہ دے سکتا تھا لیکن یہ اس کا فضل و احسان ہے کہ اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپ کو اس سے نہایت بہتر حالت میں رکھا۔

تیسری ضروری بات اپنے اندر شکر گذاری کا جذبہ بیدار رکھنے کے لیے یہ ہے کہ آدمی ہمیشہ انہی لوگوں کو دیکھنے کی کوشش نہ کرے، جو اپنے اسباب و وسایل اور اپنے حالات و ذرایع کے اعتبار سے اس سے بہتر حالت میں ہوں، بلکہ ان لوگوں کو بھی سامنے رکھ کر اپنا موازنہ کرتا رہے جو ہر پہلو سے اس سے فروتر زندگی رکھتے ہیں۔ جو آدمی ہمیشہ اپنے سے بہتر حالات رکھنے والوں ہی پر نگاہ رکھتا ہے وہ ہمیشہ اپنی تقدیر سے شاکی اور اپنے رب سے بدگمان رہتا ہے، اس کے دل کو سچی خوشی کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ اگر اس کو بہتر سے بہتر حالات بھی میسر آ جائیں جب بھی اس کا دل آسودہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ درجہ تو اس کو بہرحال حاصل ہونے سے رہا کہ اس آسمان کے نیچے کوئی شخص کسی اعتبار سے بھی اس سے بہتر حالت میں نہ رہے۔ اس وجہ سے خدا کی شکر گذاری کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ

آدمی ان لوگوں کے حالات پر نگاہ ڈالے جو اسی خدا کے بندے ہیں جس کا بندہ وہ ہے لیکن ان لوگوں کو ان چیزوں میں سے کوئی ایک چیز بھی حاصل نہیں ہے جو اس کو بڑی وسعت کے ساتھ حاصل ہیں۔

حضرت سعدیؒ کی ایک حکایت اس حقیقت کو نہایت خوبی کے ساتھ پیش کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی سیر و سیاحت کے سلسلے میں وہ دمشق یا کسی اور شہر میں جب پہنچے تو ان کی جوتی پھٹ چکی تھی اور ان کے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ وہ نئی جوتی خرید سکیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اپنی اس غربت کے سبب سے دل میں نہایت ملول تھا اور بار بار یہ خیال ذہن میں پیدا ہو رہا تھا کہ اس فضل و کمال کے باوجود خدا نے مجھے اس حال میں رکھا ہے کہ میرے پاؤں میں جوتی بھی نہیں ہے۔ فرماتے ہیں کہ میں اسی ملال کے ساتھ شہر کی مسجد میں داخل ہوا۔ وہاں پہنچا تو میری نظر ایک ایسے شخص پر پڑی جس کے سرے سے پاؤں ہی نہیں تھے۔ اس کو دیکھتے ہی میں دفعتہً اپنے رب کے آگے سجدے میں گر پڑا کہ اس کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے مجھے جوتی نہیں تو پاؤں تو دیئے ہیں، یہ بیچارہ تو سرے سے پاؤں ہی سے محروم ہے۔

حضرت سعدیؒ نے اپنی اس سرگذشت میں نہایت خوبی کے ساتھ یہ بات سمجھا دی ہے کہ خدا کا شکرگذار بندہ بننے کے لیے دنیا کو کس نگاہ سے دیکھنا ضروری ہے۔ جو لوگ دنیا کو سعدیؒ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ان کو قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی وہ نشانیاں ملتی رہتی ہیں جو ان کو خدا کے شکر پر ابھارتی رہتی ہیں لیکن جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ کتنوں کے پاس پاؤں ہی نہیں ہیں اپنی اس محرومی پر خدا سے شاکی رہتے ہیں کہ ان کے پاس کار نہیں ہے، وہ کبھی بھی خدا کی شکرگذاری کی توفیق نہیں پاتے۔

عبادت خدا کے ساتھ ہمارے تعلق کی دوسری بنیاد عبادت ہے۔ بندے کے اندر جب اپنے منعم حقیقی کے لیے شکر کا جذبہ پیدا ہوا تو یہ جذبہ قدرتی طور پر منعم کے لیے اظہار احسان مندی، اظہار نیازمندی اور اظہار تذلل کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ انسان کی فطرت کی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ اپنے منعم و محسن کے لیے اس کی طرف سے آپ سے آپ یہ بات ظاہر ہوتی ہے۔ انسان تو انسان حیوانات تک کی جبلت کا بھی یہی حال ہے۔ کتے، بلی، گھوڑے، گدھے جس کی بھی آپ پرورش کیجیے اور جس پر بھی کوئی احسان کیجیے ناممکن ہے کہ وہ آپ کو دیکھیں اور آپ کے سامنے اپنی نیازمندی اور اپنی ممنونیت کا اظہار نہ کریں۔ یہ ممنونیت ان کی آواز، ان کی حرکات اور ان کی صورت و ہیئت ہر چیز سے ظاہر ہوتی ہے۔

یہ چیز انسان کی فطرت کے اندر حیوانات کی جبلت کے لحاظ سے زیادہ نمایاں ہے اور زیادہ نمایاں ہونی چاہیے بھی۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ جب کبھی ہم پر کسی طرح کا کوئی احسان ہوتا ہے، ہم اس کے احسان پر اپنی ممنونیت کا اظہار اپنی زبان سے بھی کرتے ہیں اور اپنی صورت و ہیئت سے بھی۔ جو لوگ محسن کے احسان کا یہ حق ادا نہیں کرتے وہ ہمارے اندر کمینے اور ناحسان شناس سمجھے جاتے ہیں۔ ہمارا یہ رویہ اپنے عام محسنوں کے ساتھ ہوتا ہے یا ہونا چاہیے اور یہی رویہ فطرت انسانی کا حقیقی تقاضہ ہے۔ پھر اسی سے اندازہ کیجیے کہ اس ذات کے انعامات و احسانات کے مقابل میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے جو نہ صرف تمام انعامات و احسانات ہی کا منبع ہے بلکہ خود ہمارے وجود کا سرچشمہ بھی ہے اور جس کے انعامات و احسانات عارضی اور وقتی نہیں ہیں بلکہ دائمی اور ابدی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے حقیقی محسن و مربی کے لیے بندہ اپنی کامل نیازمندی اور کامل بندگی کا اظہار کرنا چاہے گا۔ اگر اس نے اپنی فطرت میں کوئی خرابی نہیں پیدا کرلی ہے تو یہ چیز عین اس کی فطرت کا مطالبہ ہے جس کو پورا کیے بغیر وہ دل کا اطمینان اور روح کا سکون حاصل ہی نہیں کر سکے گا۔ اگر کسی کے اندر یہ چیز ظاہر نہ ہو رہی ہو تو غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے دل کے اوپر یا تو غفلت کا حجاب ہے یا حماقت کا۔ غفلت کی حقیقت تو اس سلسلہ مباحث میں مختلف مواقع پر ظاہر کی جا چکی، اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ رہی حماقت تو اس سے ہماری مراد یہ ہے کہ بہت سے لوگ ان اسباب و وسائط ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھتے ہیں جو ان کے اور حقیقی منعم کے درمیان حائل ہوتے ہیں، حقیقی منعم کا یا تو ان کو کوئی خیال ہی نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو بالکل ضمنی اور محض سرسری طور پر۔

اسی اظہار ممنونیت و نیازمندی اور اسی اظہار تذلل کو عبادت کہتے ہیں۔ یہ اظہار زبان، حرکات اور صورت و ہیئت ہر چیز سے ہوتا ہے، جب تک ہر چیز سے یہ اظہار نہ ہو اس کی اصل حقیقت وجود پذیر نہیں ہوسکتی اس وجہ سے آدمی کی عبادت کی تکمیل میں اس کی ہر چیز کسی نہ کسی نوعیت سے شریک ہوتی ہے۔ سر سے لے کر پاؤں تک اس کے جتنے بھی اعضاء و جوارح ہیں سب اس میں اپنا حصہ ادا کرتے ہیں، اسی طرح اس کے اندر جتنی بھی عقلی اور روحانی قابلیتیں ہیں سب اس میں اپنا نذرانہ پیش کرتی ہیں، بلکہ اس کی حقیقی تکمیل ہوتی ہی اس وقت ہے جب آدمی اپنے ان وسائل و ذرائع کو بھی اس کام میں شریک کرے جن سے وہ اس دنیا میں اپنی ضروریات، اپنی خواہشوں اور اپنے منصوبوں کی تکمیل کرتا ہے۔

یہ بات کچھ زیادہ دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت اس جذبۂ شکر گذاری کا مظہر ہے جو اپنے منعم حقیقی کے لیے بندے کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ اس کا سب سے زیادہ واضح ثبوت سورۂ فاتحہ ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے شکر کی سورہ ہے اور اس کو اسلام کی سب سے بڑی عبادت — نماز — کی خاص سورہ قرار دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں سورہ فاتحہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بندے پر خدا کی ربوبیت اور اس کی رحمانیت و رحیمیت کی شانوں کے مشاہدے سے شکر گذاری کا جو جذبہ طاری ہوتا ہے اس کا پہلا تقاضا جو اس کی زندگی میں نمایاں ہوتا ہے وہ ایاک نعبد (ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں) کا اقرار ہے۔

قرآن مجید کے دوسرے مواقع سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت خدا کی شکر گذاری ہی کی عملی صورت ہے۔ مثلاً فرمایا ہے:

بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ (۶۶ زمر) بلکہ اللہ ہی کی بندگی کر اور اس کے شکر گذاروں میں بن

دوسری جگہ فرمایا ہے:-

وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ (۱۷ - عنکبوت) اور اس کی بندگی کرو اور اس کے شکر گذار بنو۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق روایات میں آتا ہے کہ آپ رات میں نمازوں میں اتنی اتنی دیر تک قیام فرماتے کہ آپ کے دونوں پاؤں سوج سوج جاتے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے پوچھا کہ یا رسول اللہ جب آپ کے تمام اگلے اور پچھلے گناہ بخشے جا چکے ہیں تو آپ اتنی مشقت کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ کیا میں یہ بات نہ چاہوں کہ خدا کا شکر گذار بندہ بنوں۔ (متفق علیہ)

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ عبادات میں اصل محرک خدا کی شکر گذاری کا احساس اور جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اگر ہمیں اپنی عبادت کا حکم دیا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو یہ بات پسند آئی کہ وہ ہمیں کسی مشقت اور زحمت میں مبتلا کرے بلکہ اس نے یہ پسند فرمایا کہ ہمارے جذبۂ شکر گذاری کے اظہار کے لیے ایسی شکلیں معین فرمادے جو اس کی نگاہوں میں پسندیدہ اور ہمارے لیے زیادہ سے زیادہ نافع اور موجب خیر و برکت ہیں۔

عبادت کی اس روح کے لحاظ سے حقیقی عبادت وہی ہے جو خدا کی شکر گذاری کے سچے جذبے کے ساتھ ادا کی جائے۔ اگر کوئی عبادت اس جذبے سے خالی ہو، آدمی اس کو ایک بار اور ایک مصیبت سمجھ کر کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑانے کی کوشش کرے تو یہ عبادت وہ عبادت نہیں ہے جو خدا کے ہاں قبولیت کا درجہ

حاصل کرے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ بندہ خدا کی عبادت کر کے درحقیقت وہ سب سے بڑا حق ادا کرتا ہے جو اس کے خالق و مالک اور منعم و محسن پروردگار کا اس کے اوپر عاید ہوتا ہے اور یہ حق وہ اس لیے ادا نہیں کرتا کہ اس میں اس کے خالق و مالک کا کوئی نفع ہے بلکہ محض اس لیے ادا کرتا ہے کہ اس میں خود اس کا اپنا سراسر نفع ہے، اس طرح وہ اپنے آپ کو ان انعامات کا مزید سزاوار بناتا ہے جو اس کو اس کے رب کی جانب سے بلا کسی استحقاق کے حاصل ہیں۔ قرآن مجید کی متعدد آیات سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ خدا کی عبادت درحقیقت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ خالق ہے، مالک ہے، مربی ہے، پروردگار ہے نہ اس لیے کہ اس کے کرنے سے خدا کو کوئی نفع پہنچتا ہے یا نہ کرنے سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ چند آیتیں ملاحظہ ہوں:

وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ (یٰسین) اور مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس ذات کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔

اُعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبَّكُمْ (۷۲ مائدہ) اور اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی اور تمہارا رب بھی ہے۔

خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ (۱۳ انعام) وہ ہر چیز کا خالق ہے تو اسی کی بندگی کرو۔

اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ (۱۵ طٰہٰ) بے شک میں ہی اللہ ہوں، نہیں ہے کوئی معبود مگر میں تو میری ہی بندگی کرو۔

مذکورہ بالا آیات سے صاف واضح ہے کہ خدا کی عبادت اس لیے واجب ہے کہ وہی خالق و فاطر ہے، اس لیے واجب ہے کہ وہی رب اور مالک ہے، اس لیے واجب ہے کہ وہی تنہا معبود ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اگر ہماری اس عبادت سے خوش ہوتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس سے اس کو کوئی نفع پہنچتا ہے۔ اسی طرح اگر وہ عبادت نہ کرنے سے ناخوش ہوتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ وہ ہر قسم کے نفع و نقصان سے بالکل بے نیاز ہے۔ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ "اے میرے بندو، اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جنات اور انسان سب کے سب زیادہ سے

زیادہ متقی بن جائیں جب بھی وہ میری بادشاہی میں کوئی اضافہ نہیں کریں گے۔ اے میرے بندو، اگر تمہارے اگلے اور پچھلے اور جنات اور انسان سب کے سب مل کر زیادہ سے زیادہ نافرمان بن جائیں جب بھی وہ میری بادشاہی میں کوئی کمی نہیں کریں گے۔

(ریاض الصالحین بحوالہ مسلم)

اللہ تعالیٰ کے ہماری عبادت سے خوش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس طرح بندہ ترقی اور کمال کے اس راستہ پر چل پڑتا ہے جس پر چلنے اور جس کو حاصل کرنے ہی کے لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے۔ بندے کا ترقی و کمال کی راہ میں پہلا قدم ہمارے خالق و مالک کے نزدیک یہی ہے کہ ہم سب سے پہلے اس کے اس حق کو پہچانیں۔ اگر ہم نے یہ پہلا قدم صحیح اٹھا دیا تو آگے کی راہ آپ سے کھلتی جائے گی اور اگر خدانخواستہ یہ پہلا ہی قدم نہ اٹھایا یا اٹھایا لیکن غلط اٹھا تو پھر آگے کوئی قدم بھی صحیح اٹھنے کی توقع نہیں ہے۔ پھر انسان جو قدم بھی اٹھائے گا غالب یہی ہے کہ وہ غلط اٹھائے گا اور جتنا ہی آگے بڑھتا جائے گا وہ خدا کی راہ سے دور اور شیطان کی ٹھہرائی ہوئی منزل مقصود سے قریب ہوتا جائے گا۔

(باقی آئندہ)

بقیہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت حدیث اور حضرت عمرؓ

جسے اپنے کام پر پورا پورا اعتماد ہو یہاں تک کہ وہ اپنی ہر روایت حضرت عمرؓ جیسے نقاد کی کسوٹی پر پرکھوانے کے لیے بھی ہر وقت تیار ہو۔ ایک عام راوی جو بے سوچے سمجھے روایت کرنے کا عادی ہو یہ اخلاقی جرأت نہیں دکھا سکتا تھا کہ ایسے شدید نقادوں کے سامنے بالکل بے جھجک اپنی روایات پیش کر سکے۔ یہ وہی شخص کر سکتا ہے جسے اپنے علم و حافظہ پر بھی اعتماد ہو، اپنی سچائی پر بھی اعتماد ہو اور ساتھ ہی وہ علم نبیؐ سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہو۔

(باقی آئندہ)

خط و کتابت کرتے وقت پتہ صاف اور خوشخط تحریر کریں

سفرِ حج

امین احسن اصلاحی

واپسی

(۲)

میں جب جہاز پر اپنے کیبن میں پہنچا ہوں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ سفر ختم ہو گیا اور ہم اپنے گھر پہنچ گئے۔ اسی کمرے میں ہم اس سے پہلے چھ سات راتیں نہایت آرام و سکون کی گذار چکے تھے اس وجہ سے اس کی ایک ایک چیز سے ہم آشنا اور مانوس تھے۔ ہم نے پہلے تو قرینہ سے اپنا سامان مرتب کیا۔ اس کے بعد ساحل جدہ کو رخصت کرنے کے لیے عرشہ پر کھڑے ہو گئے۔ اسی دوران میں ہمارے حج انفسر جہاز تشریف لائے۔ حکیم صاحب نے ان سے تعارف کرایا۔ کھڑے کھڑے دو دو باتیں ان سے ہوئیں۔ اتنے میں جہاز نے روانگی کی سیٹی دے دی۔

جہاز کی روانگی کے بعد میں بہت دیر تک ساحل اور اس کے محبوب آثار کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد غسل کر کے کپڑے بدلے اور جہاز کی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس کی ہر چیز سے طبیعت پہلے سے، جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، مانوس تھی اس وجہ سے کسی نئے ماحول سے مناسبت پیدا کرنے کا سوال نہیں تھا۔ وہی جانے پہچانے مسافر، وہی صورت آشنا افسر، وہی خدمت کرنے والے خانسامے اور بیرے، اور وہی سرگرم اور مصروف خلاصی۔ غرض ہر چیز جانی بوجھی ہوئی۔ میں دو ڈھائی مہینوں کی دوا دوش کی زندگی کے بعد جب شام کو کرسی بچھا کر برآمدہ میں بیٹھا اور سمندر کی اچھلتی ہوئی موجوں پر نظر پڑی تو معلوم ہوا کہ سفر کی ساری تکان دور ہو گئی۔ ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ انسان کا نفس کتنا آرام پسند واقع ہوا ہے۔

بہت سے لوگوں سے جاتے ہوئے جہاز کے عرشے ہی پر ملاقات ہوئی تھی۔ اب پھر دو ڈھائی مہینوں کے بعد اسی عرشے پر ملاقات ہوئی۔ ہر ایک نے اس دوران کی اپنی روداد سنائی اور ہماری روداد

سنی بعض کے متعلق یہ اطلاع بھی ملی کہ اسی دوران میں وہ اپنے رب کے پاس جا پہنچے۔ اکثروں کو دیکھ کر مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ اس سخت سفر نے ان کی صحتوں کو بہت متاثر کیا ہے۔ بعض لوگوں کی شکلیں تو اس قدر تبدیل ہوگئی تھیں کہ میرے لیے ان کا پہچاننا مشکل ہوگیا، حالانکہ ڈھائی ماہ پہلے اسی جہاز میں ان سے اچھا خاصا تعارف حاصل ہو چکا تھا۔

سردھانا کے روز و شب جاتے ہوئے جہاز کے عرشے پر حاجیوں کے اندر جو دینی سرگرمیاں محسوس ہوتی تھیں واپسی میں وہ سرگرمیاں تو بہت کم ہوگئی تھیں تاہم نماز باجماعت کا اہتمام دوسرے ہی دن سے شروع ہوگیا۔

اس مرتبہ جہاز میں پینے کا پانی بڑا خراب تھا۔ اگرچہ مکہ معظمہ میں نمکین پانی پینے کے ہم کچھ عادی سے ہوگئے تھے مگر یہ پانی اس قدر بے مزہ تھا کہ اس نے میرے اس پرلطف سفر کا سارا مزہ ہی کرکرا کر دیا۔

اب کے سردھانا کے میس کا انتظام بھی کچھ گڑبڑ ہی رہا۔ ناشتوں اور کھانوں کی ریل پیل تو وہی پہلے جیسی تھی، تنوعات میں بھی کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی لیکن ہر چیز پھیکی پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک روز تو میں ان کے مرغ دماہی سے اتنا بیزار ہوا کہ میں نے خشکہ اور دال کی فرمائش کی تاکہ کھانے کی بے مزگی کا سوال ہی نہ پیدا ہو۔

اب کے دریا میں تلاطم بھی رہا اور گرمی بھی بڑی سخت رہی۔ تلاطم سے مجھے الحمد للہ کچھ زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ میں برابر صبح شام چہل قدمی بھی کرتا رہا، کھاتا پیتا بھی رہا اور برآمدے میں کرسی بچھا کر اسی سفرنامہ کے کچھ صفحات بھی لکھ لیتا۔ لیکن عام طور پر جہاز کے مسافر امتلاء اور دردِ سر ہی میں مبتلا رہے۔ البتہ گرمی سے مجھے بھی بڑی سخت تکلیف رہی۔ کیبن کے اندر پنکھے کی ہوا ناکافی ہوتی تھی۔ اگرچہ کمروں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے پلانٹ لگے ہوئے تھے اور میرا خیال ہے کہ درجہ اول کے مسافروں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا حق بھی حاصل رہا ہوگا لیکن ہمارے جہاز کے منتظمین حاجیوں اور دوسرے مسافروں کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس فرق کو ملحوظ رکھنے میں پہلی ٹرپ میں ان سے جو بعض کوتاہیاں ہوگئی تھیں اس دوسری ٹرپ میں انھوں نے اس کی کسر نکال لی۔

عدن میں اب کے ہمارے جہاز کو عدن سے پانی اور تیل لینا تھا اس وجہ سے سیدھے کراچی پہنچنے کے بجائے اس کو چند گھنٹوں کے لیے عدن میں ٹھہرنا پڑا۔ یہاں ہم رات میں پہنچے اس وجہ سے باہر کی

دنیا کا کوئی اندازہ کرنا تو مشکل تھا لیکن میں نے جتنی تعداد میں اور جتنی قسموں کے جہاز یہاں لنگر انداز دیکھے اس سے پہلے کسی بندرگاہ میں نہیں دیکھے تھے۔ ہمارا جہاز جتنی دیر تک وہاں ٹھہرا رہا انگریز قوم کی پوری استعمار کے خلاف میرے دل میں بار بار نفرت کا جذبہ ابھرتا رہا۔

جب ہمارا جہاز ٹھہرا تو میں نے دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں چیزیں بیچنے والے جہاز کے نیچے آگئے اور حاجی حضرات، جن کے پیٹ مکہ کی خرید و فروخت سے نہیں بھرے تھے، خرید و فروخت میں مشغول ہوگئے۔ اس خرید و فروخت کا سب سے زیادہ دلچسپ پہلو یہ تھا کہ مول بھاؤ طے کر لینے کے بعد بیچنے والے اپنا مال ایک ٹوکری میں رکھ کے اس کی رسی جہاز کے اوپر پھینک دیتے اور اوپر والے اس کو کھینچ لیتے۔ اسی طرح خریدنے والے اپنے پیسے ٹوکری میں رکھ کے اوپر سے کشتی میں لٹکا دیتے۔ یہ دلچسپ تجارت بڑی دیر تک ہوتی رہی اور میں نے دیکھا کہ اسی طرح خربوزے اور تربوز سے لے کر غالیچوں، اور قالینوں تک ہر چیز کی لوگوں نے خرید و فروخت کی۔

عدن کے بعد عدن کے بعد گرمی تو موسمی ہواؤں کے چل جانے سے کچھ کم ہوگئی جس سے میں نے اطمینان کا سانس لیا لیکن دریا کا تلاطم کچھ زیادہ ہوگیا جس سے جہاز کی چہل پہل بالکل ختم ہوگئی۔ بالخصوص ڈک کے مسافروں کی نقل و حرکت تو بالکل ہی بند ہوگئی۔ مگر یہ خوشی کی بات ہے کہ نماز باجماعت کا اہتمام اس کے باوجود بھی بعض دین داروں کی سرگرمی سے قائم رہا اگرچہ جہاز کی حرکت کا یہ عالم تھا کہ بسا اوقات رکوع میں جاتے ہوئے آدمی بے تحاشا سجدے میں گر پڑتا تھا۔

قرب کراچی کی خوشی یہ اعلان جہاز میں روزانہ ہو جاتا تھا کہ اب کراچی سے ہم اتنے دور رہ گئے ہیں اور یہ دوری جس رفتار سے کم ہوتی جا رہی تھی، اسی رفتار سے لوگوں میں ایک چہل پہل بھی نمایاں ہونے لگی تھی۔ مگر میں نے لوگوں کی گفتگوؤں سے اندازہ کیا کہ عام طور پر لوگوں کے دلوں پر کراچی پہنچنے کی خوشی سے زیادہ کراچی کے کسٹم والوں کا ہول طاری ہے۔ جو شخص بھی بات شروع کرے سفر ختم ہونے اور وطن پہنچنے کی خوشی کا اظہار تو ایک دو فقروں میں کرے لیکن کسٹم والوں کی داروگیر، ان کی رشوت ستانیوں اور ان کی پیدا کردہ پریشانیوں کی ایک لمبی اور خوفناک داستان سنا ڈالے۔ میں لوگوں کی زبانی یہ داستانیں سنتا اور اس صورتِ حال پر افسوس کرتا رہا۔ میرے لیے اس صورتِ حال کا سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ تھا کہ اتنے لمبے سفر سے لوٹنے والے یہ مسافر محض کسٹم کے خوف سے اب تک مراجعتِ وطن کی حقیقی

خوشی سے محروم تھے۔ میں نے بعض لوگوں سے کہا کہ کسٹم والوں سے اس قدر کیوں گھبراتے ہو؟ جو سامان تمہارے پاس موجود ہیں، ان کے سامنے رکھ دینا اور ان سے کہنا کہ قاعدے کی رو سے اس کا جو محصول بنتا ہے وہ لے لو۔ میں نے انھیں بتایا کہ میں ایسا ہی کروں گا۔ وہ مجھے اس کا یہ جواب دیتے کہ ابھی اس سے کچھ نہیں بنتا، اس کے باوجود بھی آدمی ان کسٹم والوں کے ہاتھوں بڑا پریشان ہوتا ہے۔

کسٹم کا ہول بالآخر جہاز کراچی کے سمندر میں داخل ہوگیا اور یہ اعلان ہوگیا کہ جہاز اتنے بجے لنگر انداز ہوجائے گا۔ لوگوں نے اترنے کے لیے اپنے سامان ٹھیک ٹھاک کرنے شروع کر دیے۔ میرے لیے لوگوں کی اس تیاری کا سب سے زیادہ عجیب پہلو یہ تھا کہ بہتوں کو میں نے دیکھا کہ انھوں نے پانچ پانچ کے پورے پورے تھانوں کی پگڑیاں باندھ لی ہیں، بعضوں نے بیک وقت دو دو بلکہ تین تین قمیصیں اوپر نیچے پہن رکھی ہیں، بعض لوگوں نے دونوں ہاتھوں میں گھڑیاں باندھ رکھی ہیں، عورتوں نے بعض کپڑے بن سلے یا نیم سلے ہی پہن لیے ہیں۔ بعض لوگوں نے اپنے بچوں کو عربی لباس پہنا کر سر پر عقال باندھ دی ہے۔ یہ منظر جب میں نے دیکھا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا کہ جیسے یہ سارے لوگ کسی ڈرامے شو میں حصہ لینے کے لیے تیاری کر رہے ہوں۔ جب مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ یہ سب کچھ کسٹم کا ہول لوگوں سے کرا رہا ہے تو میں نے دل میں سوچا کہ یہ کسٹم بھی کیا مصیبت ہے جس نے اچھے خاصے سنجیدہ اور دیندار آدمیوں کو اس طرح کی ثقاہت سے گری ہوئی حرکتیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

بندرگاہ کراچی جب جہاز بندرگاہ کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ اسٹیمروں پر سوار اپنے اپنے حاجیوں کے استقبال کے لیے نکلے ہوئے ہیں۔ کم و بیش تین مہینوں کے بعد وطن کی سرزمین اور اہل وطن کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ جہاز کا سفر کتنا ہی آرام دہ ہو لیکن جب سفر ختم ہوتا ہے اور آدمی کو وطن کے ساحل کی خشکی نظر آتی ہے تو اسے بے اندازہ خوشی ہوتی ہے۔ بلا مبالغہ معلوم ہوتا ہے از سر نو زندگی حاصل ہوئی ہے۔

جب جہاز نے لنگر ڈال دیے تو حکیم صاحب نے مجھے یہ ہدایت کی کہ میں پہلے اتر جاؤں، وہ خود سامان اتروانے کے بعد اتریں گے۔ اتفاق کی بات کہ پاسپورٹ وغیرہ کے معائنہ میں مجھے کوئی زحمت نہیں پیش آئی اور میں فوراً اترنے میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے سفر سے واپسی کی دعا پہلی بار یہاں پڑھی اور کراچی کی زمین پر قدم رکھتے ہوئے جو خوشی ہوئی ہے وہ اس دوران کی چند بڑی خوشیوں میں سے ایک ہے۔

کسٹم کے احاطہ میں کسٹم کے احاطہ میں جو کچھ پیش آنے والا تھا اس کا مجھے لوگوں کی باتوں سے ایک حد تک اندازہ تھا اس وجہ سے میں اس چیز کی طرف سے بالکل بے پروا ہو کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ میں نے سوچا کہ اب جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کے رہے گا، اس کی فکر کرنے سے کیا حاصل ہوگا۔ بیٹھتے ہی احاطہ کی سلاخوں سے ایک طرف سلطان احمد صاحب اور دوسری طرف کراچی کے بعض دوسرے احباب نظر آگئے۔ ان لوگوں کو دیکھ کر دل کو مزید اطمینان ہوگیا کہ جو رسوائی یہاں ہوتی ہے اس میں شریک ہونے والے اب بہت سے ہوگئے ہیں، سب مل کے بانٹ لیں گے۔

یہاں کچھ دیر بیٹھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں ہم بالکل ڈاکوؤں کے نرغہ میں ہیں۔ جو شخص بھی آتا تھا وہ جاں بخشی کی شرط ایک متعین بھاری رقم بتاتا تھا۔ مجھ سے تو جس نے بھی بات کرنی چاہی میں نے اس کو نہایت ترشی کے ساتھ جواب دیا لیکن ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہاں سے نکلنے کا راستہ ایک ہی ہے، وہ یہ کہ دلالوں کو، افسروں کو اور پھاٹک کے پہرہ داروں کو رشوت دیجیے تب یہاں سے نکلیے، اس کے سوا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا تھا۔

بڑی دیر کے بعد ایک ثقہ اور سنجیدہ بزرگ آئے، انھوں نے مجھ سے سلام و مصافحہ کیا اور میرے بارے میں کسٹم کے ایک افسر سے کچھ بات کی اور چلے گئے۔ اس کے بعد اس نے میرے تمام سامانوں پر یکے بعد دیگرے ٹک مارک لگا دیے، رسمی طور پر بھی اس نے کچھ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

اس ہنگامہ قیامت کے دوران میں بغیر کسی گھبراہٹ اور پریشانی کے یہ سارا تماشا دیکھتا رہا۔ میرا اندازہ ہے کہ ہزاروں روپے غریب حاجیوں کے جیبوں سے وصول کیے گئے ہوں گے لیکن شاید ہی اس رقم میں سے ایک پیسہ حکومت کو ملا ہو۔ یہ ساری رقم بیچ کے آدمیوں نے کھالی۔ امید ہے کہ اب انقلابی حکومت نے ان حالات میں تبدیلی پیدا کر دی ہوگی اور حجاج اس لوٹ اور اس ذلت و رسوائی سے محفوظ ہوگئے ہوں گے۔

کئی گھنٹے خراب ہونے کے بعد جب احاطہ سے باہر نکلنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس دروازے کے پہرہ داروں کو بھی کچھ نذر دینی پڑتی ہے۔ اس کے بغیر یہ سامان باہر نہیں نکلنے دیتے۔ غرض ہر قدم پر ایک نئی مصیبت سے سابقہ تھا۔ خدا خدا کر کے کسی طرح اس دار العذاب سے رہائی ہوئی اور باہر آکر کراچی کے دوستوں سے ملاقات ہوئی تب جا کر ان تعاقب کرنے والوں کے اندیشہ سے جان چھوٹی۔

پیر کالونی میں یہاں سے برادرم شیخ سلطان احمد صاحب کے ساتھ ہم ان کے مکان واقع پیر کالونی پر آ گئے۔ اگرچہ یہاں پہنچ جانے کے بعد میرا ذہن سفر کے احساس سے بالکل آزاد ہو گیا لیکن معلوم نہیں کیوں یہاں پہنچتے ہی بچوں ...... اور اماں کو دیکھنے کے لیے میرے دل میں بڑی بیتابی پیدا ہو گئی۔ اس پورے سفر میں الحمد للہ میرا ذہن بچوں اور گھر کے خیال سے بالکل فارغ رہا۔ اماں کو (اللہ تعالیٰ ان کو غریق رحمت کرے) ہم بستر مرض بلکہ بستر مرگ پر چھوڑ کر گئے تھے، مریم صدیقہ سلمہا کو بھی پہلی مرتبہ اتنے دنوں کے لیے ہم نے اپنے سے جدا کیا تھا، ننھے سلمان راشد کی پیاری پیاری حرکتیں بھی یاد آسکتی تھیں لیکن کراچی پہنچنے تک میں ان ساری باتوں سے تقریباً خالی الذہن سا رہا لیکن کراچی پہنچتے ہی اس دنیا کی سب سے پہلی چیز جو میرے دل پر حملہ آور ہوئی وہ بچوں کی یاد تھی۔ اور ساتھ ہی اماں کی بیماری کا خیال۔

میں نے سلطان احمد صاحب سے کراچی سے روانگی کا پروگرام معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے ہماری سیٹ تو ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی بک کرا چھوڑی ہے لیکن ۳۶ گھنٹے کراچی میں قیام کے لیے بھی انھوں نے مخصوص کر لیے ہیں۔ سلطان صاحب کے بنائے ہوئے اس پروگرام میں کسی تبدیلی کی گنجائش تو تھی نہیں، انھوں نے سارا پروگرام اپنی عادت کے مطابق اچھی طرح سوچ کر بنایا تھا لیکن کراچی میں یہ قیام ذرا دل پر شاق گذرا۔ اگرچہ یہ فوائد سے خالی نہیں رہا۔

ایک لطیفہ پیر کالونی میں پہلی نماز میں نے مغرب کی پڑھی۔ یہاں مسجد میں ایک لطیفہ پیش آیا۔ مسجد سے نکلتے ہوئے جب میں نے اپنا جوتا دیکھا تو اس کو غائب پایا۔ اس پورے سفر میں ہم اپنی چیزوں کی طرف سے بہت بے پروا رہے تھے لیکن خدا کے فضل سے کہیں کوئی چیز غائب نہیں ہوئی۔ کراچی میں آتے ہی جوتے کی چوری اور وہ بھی مسجد سے سچی بات یہ ہے کہ میرے لیے سخت شرمندگی کا باعث ہوئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ چوری میں نے ہی کی ہے اور میری یہ چوری پکڑ بھی لی گئی ہے۔ سلطان صاحب نے جب مجھے شرمندہ کھڑے دیکھا تو وہ تاڑ گئے، جھپٹ کے آئے اور اپنی چپل میرے سامنے رکھ کے کچھ ایسے کلمات انھوں نے کہے جس سے میری کھسیاہٹ دور ہو۔ جوتے کا تو مجھے کچھ زیادہ افسوس نہیں ہوا، سلطان صاحب نے نیا جوتا خرید کر پہنا دیا، اگر کچھ افسوس ہوا بھی تو صرف اس پہلو سے ہوا کہ بڑے مبارک سفر میں یہ رفیق سفر رہا تھا، لیکن اس واقعہ کا خیال کر کے مجھے شرمندگی کا احساس بار بار ہوتا رہا۔

اس واقعہ سے پہلے مجھے ان لوگوں سے کچھ زیادہ ہمدردی نہیں ہوتی تھی جو اپنے جوتے نماز کے دوران

بڑی احتیاط سے اپنے آگے رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس کے بعد سے مجھے اس قسم کی احتیاط کرنے والوں کے ساتھ تھوڑی سی ہمدردی ہو گئی۔ اب میں خیال کرتا ہوں کہ نماز پڑھتے ہوئے بجائے اس کے آدمی اپنے جوتے کی طرف سے اندیشوں میں مبتلا رہے یہ بہتر ہے کہ جوتے آگے رکھ لے تاکہ نماز اطمینان اور دل جمعی کے ساتھ پڑھ سکے۔

کراچی سے لاہور کراچی میں یہ ۳۶ گھنٹے گذار کے اور احباب سے مل ملا کے ہم لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ریل میں جو رات میں نے گذاری اس میں شاید ایک منٹ بھی میں نہیں سویا۔ نہ سونے کی وجہ کوئی پریشانی نہیں تھی بلکہ شاید صرف اس خوشی کے سبب سے نیند نہیں آئی کہ کل صبح ہم خدا نے چاہا تو بچوں کو دیکھیں گے اور اماں کی قدم بوسی حاصل کریں گے۔ جب گاڑی لاہور چھاؤنی اسٹیشن پر پہنچی تو نعمان میاں سلمہ نظر پڑے۔ یہ ملتان سے ہمارے ہی خیال سے سوار ہوئے تھے لیکن محض اس خیال سے ہم سے ملنے کی کوشش نہیں کی کہ ہم سو رہے ہوں گے۔ ان کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ چند منٹوں میں گاڑی لاہور اسٹیشن میں داخل ہو گئی۔ ہم نے سفر سے واپسی کی مسنون دعا پڑھی۔ بچوں کو دیکھا اور پیار کیا۔ جو مخلصین اسٹیشن پر آگئے تھے ان سے سلام مصافحہ کیا۔

اس قسم کے کسی سفر سے واپسی کے موقع پر جو خوشی آدمی کو ہوا کرتی ہے اس کا تھوڑا بہت تجربہ ہر ایک کو ہوگا۔ میرے نزدیک تو اس خوشی کی یہ اہمیت ہے کہ مجرد یہ ختم سفر کی خوشی ہی آدمی کے تمام مصائب سفر کا معاوضہ بن جاتی ہے، سفر کی دوسری برکتیں بس نفع ہی نفع ہیں۔

غالباً ۱۰ مئی ۵۸ء کی صبح کو ہم اس مبارک سفر پر روانہ ہوئے تھے اور ۱۹ اگست ۵۸ء کی صبح کو ہم بخیریت وسلامت گھر پہنچ گئے۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین

"میثاق" بابت جون و اکتوبر

جون اور اکتوبر ۵۹ء کے میثاق کے پرچے اگر کسی خریدار یا ایجنٹ صاحب کے پاس فاضل موجود ہوں تو وہ دفتر کو بھیج کر ہم سے ان کی قیمت وصول کر لیں یا اپنے حساب میں وضع کرا لیں۔

مینیجر

قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ جو لوگ دوزخ میں ڈالے جائیں گے وہ خود اس بات کا اقرار کریں گے کہ انھیں جو سزا ملی ہے وہ اس کے حقدار تھے، انھوں نے اپنے آنکھ، کان، دل، دماغ سے کام نہیں لیا، خدا کی نشانیوں، اس کے نبیوں کی باتوں اور اس کی کتابوں کی حکمتوں کی کوئی پروا نہیں کی اس وجہ سے اس انجام کو پہنچے۔ اگر وہ سننے سمجھنے والے لوگ ہوتے، اپنی عقل اور سمجھ اور سمع و بصر سے کام لیتے تو اس دوزخ میں نہ پڑتے۔ وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ، فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (اور کہیں گے کہ اگر ہم بات سننے والے یا سمجھنے والے ہوتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے، پس وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے تو دفع ہوں یہ دوزخی)

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ دوزخ میں صرف وہی لوگ جائیں گے جن پر حجت تمام ہو چکی ہوگی اور اس حجت کے تمام ہونے کی شہادت دوسرے ان کے خلاف نہیں دیں گے بلکہ وہ خود دیں گے۔ وہ خود ہی اس امر کا اعتراف کریں گے کہ انھوں نے خود اپنی نالائقیوں سے اپنی یہ شامت بلائی ہے، اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ہم اور آپ اس دنیا میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کن لوگوں پر خدا کی حجت تمام ہے اور کن پر تمام نہیں ہے۔ یہ فیصلہ صرف خدائے عالم الغیب ہی آخرت میں کرے گا، جہاں وہ ہر شخص کے سمع، بصر، فواد اور عقل سے یہ شہادت دلوا دے گا کہ کس نے خدا کی کیا کیا نافرمانیاں اپنی عقل و فطرت سے بغاوت کر کے محض نفس کی پرستش میں کی ہیں اور کون کون سی غلطیاں جہالت اور بے خبری کے عالم میں کی ہیں۔ جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے چاند اور مریخ تک پرواز کرنے کی صلاحیتیں دی ہیں وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس انسان کے اندر خود خدا تک پہنچنے کے لیے کیا کیا صلاحیتیں ودیعت ہیں اس وجہ سے اسے حق ہے کہ وہ اس انسان سے پوچھے کہ تمھیں یہ چاند کے چھپے ہوئے دھبے تو نظر آگئے لیکن خدا جو تل کے اوٹ میں پہاڑ کی طرح چھپا ہوا تھا وہ تمھیں نظر نہیں آیا۔

اسی طرح جو لوگ موسیٰؑ اور محمدؐ، تورات اور انجیل کے ماننے کے مدعی ہیں، اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان کے محامد بیان کرتے پھرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ایک طرف ان کے کارناموں کے رجسٹر ان کے آگے کھول کر رکھ دے گا اور دوسری طرف تورات، انجیل اور قرآن کو کھول کر رکھ دے گا، اور پھر پوچھے گا کہ کیا موسیٰؑ

اور محمدؐ نے تمہیں انہی باتوں کی تعلیم دی تھی؟

بہرحال خدا کے ہاں جو جزا و سزا بھی ہوگی پوری طرح حجت تمام کرنے کے بعد ہی ہوگی۔ یہاں تک کہ ہر مجرم خود پکار اٹھے گا کہ اسے جو سزا ملی ہے بالکل انصاف کے ساتھ ملی ہے۔

اب اس اتمام حجت کے بعد بھی اور اس فطرت سے نوازے جانے کے علی الرغم جس کا ذکر پہلے سوال کے جواب کے سلسلہ میں آ چکا ہے اگر انسانوں کی اکثریت دوزخ ہی میں گرے تو اس کا الزام انسان ہی پر ہے نہ کہ کائنات کے خالق پر۔ وہ ابدی زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ لوگوں کو موقع دے رہا ہے اور جو زیادہ سے زیادہ الاونس ہر ایک کو مختلف حالات کے تحت ملنا چاہیے وہ بھی مہیا کر رہا ہے اب ان سب باتوں کے باوجود بھی لوگ اگر اس ابدی فوز و فلاح کا راستہ نہ اختیار کریں تو اس میں کس کا قصور ہے۔

اس بات کا زیادہ خیال نہ کیجیے کہ پھوک زیادہ نکل رہا ہے جوہر کم۔ جو خالق کائنات اس دنیا کو بلو رہا ہے وہی جانتا ہے کہ اس دودھ سے کچھ مکھن نکل رہا ہے یا نہیں اور اگر نکل رہا ہے تو کتنا۔ بہرحال جب تک اس کے بلونے کا سلسلہ جاری ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سے مکھن نکل رہا ہے۔ اگر اس مکھن کا نکلنا بند ہو جائے گا تو اس کے بلونے کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ پھر قیامت آجائے گی۔

پھر اس حقیقت کو بھی یاد رکھیے کہ جس کارخانہ میں جتنا ہی زیادہ قیمتی سامان تیار ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اس کے لیے خام مواد بھی مطلوب ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے اس پر خرچ بھی اٹھتا ہے۔ اپنے اس زمانہ میں ایٹم بم کے کارخانوں ہی کو دیکھ لیجیے۔ پھر جس کارخانے میں صدیقین، شہداء اور ابرار و صالحین تیار ہو رہے ہیں کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کارخانے کے لوازم کیا کچھ ہیں۔

ختم نبوت کے بعد ہدایت خلق کا انتظام

۳۔ ختم نبوت کے بعد ہدایت خلق کی ذمہ داری امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر جو ڈالی گئی ہے تو اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے دو خاص انتظام ایسے بھی فرمائے ہیں جو اس بات کی ضمانت بہم پہنچاتے ہیں کہ اگر یہ امت بحیثیت مجموعی اپنے فرض منصبی — شہادۃ علی الناس — سے غفلت برتے جب بھی

شہادت حق کا کام بالکل معطل نہیں ہو سکتا۔

ایک یہ کہ قرآن کریم کو، جو اللہ تعالیٰ کی ہدایات معلوم کرنے کا ذریعہ ہے ہر قسم کے تحریف و تغیر سے ہمیشہ کے لیے بالکل محفوظ کر دیا ہے۔ پچھلی امتوں میں جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان کی تعلیمات اور ان کی کتابوں کی حفاظت کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام نہیں فرمایا اس وجہ سے ان کی تعلیمات اور کتابوں میں تحریفات اور تبدیلیاں ہو گئیں جن کو صرف بعد میں آنے والے انبیاء ہی درست کر سکتے تھے لیکن ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ خاتم الانبیاء ہیں، آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے آپ کی کتاب کی حفاظت کے لیے یہ انتظام فرمایا کہ اس کو جن و انس کی ہر قسم کی دراندازیوں سے ہمیشہ کے لیے محفوظ فرما دیا۔ قرآن مجید کی اس محفوظیت نے اس اندیشہ کا بالکل سدباب کر دیا ہے کہ خدا کی یہ زمین خدا کی اصل تعلیم سے کبھی بالکل محروم ہو جائے گی۔

دوسرا انتظام یہ فرما دیا ہے کہ اس امت میں ایک گروہ حق پر قائم رہنے والا اور حق کی طرف دعوت دینے والا ہر دور میں موجود رہے گا جو اپنے قول اور عمل سے خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین اور ان کے بتائے ہوئے اُسوۂ حسنہ کی شہادت برابر دیتا رہے گا۔ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی امتوں کو یہ چیز بھی حاصل نہیں تھی جس کے سبب سے بگاڑ کے دور میں ان کے اندر نہ تو خدا کی اصل تعلیم باقی رہ جاتی تھی اور نہ ان کی یاد دہانی کرنے والے اشخاص و افراد باقی رہ جاتے تھے۔ اگر کوئی شکل اس بگاڑ کی اصلاح کی باقی رہ جاتی تھی تو صرف یہ کہ کوئی نبی آ کر اس کی اصلاح کرے لیکن اس امت کو اس طرح کے کسی اندھیرے میں گھر جانے سے خدا نے محفوظ فرمایا ہے۔ اس کے لیے جیسا کہ متعدد احادیث میں وارد ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ انتظام فرمایا ہے کہ جب اس امت کے سارے جسم میں بدعت و ضلالت کا اثر اس طرح سرایت کر جائے گا جس طرح سگ گزیدہ کے جسم میں کتے کا زہر سرایت کر جاتا ہے، اس وقت بھی اللہ تعالیٰ اس کے ایک حصہ کو اس زہر کے اثر سے محفوظ رکھے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس امت پر اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد شہادۃ علی الناس کی جو ذمہ داری ڈالی ہے تو اس ذمہ داری کے تعلق سے اس امت کو من حیث الامت وہ عصمت بھی عطا فرمائی ہے جو انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتی ہے یعنی یہ امت بحیثیت افراد کے تو گمراہی اور ضلالت میں مبتلا ہو سکتی ہے لیکن بحیثیت امت کے یہ ہمیشہ ہدایت پر قائم رہے گی۔ اس کو یہ حالت کبھی نہیں

پیش آئے گی کہ پوری کی پوری امت ضلالت پر مجتمع ہو جائے، حق پر قائم کوئی گروہ اس کے اندر سرے سے باقی ہی نہ رہ جائے۔ یہی معنی ہیں اس حدیث کے جس میں فرمایا گیا ہے کہ لا تجتمع امتی علی الضلالۃ (میری امت کبھی ضلالت پر متفق نہیں ہوگی)

یہ اہتمام اس امت کے معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا ہے کہ ختم نبوت کے بعد بھی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت کے حاملین اس کے اندر باقی رہیں۔ اگر نبوت ختم نہ ہو چکی ہوتی تو اس اہتمام کی ضرورت نہ تھی۔ بالفرض خدا کی کتاب اور نبی کی سنت مٹ بھی جاتی تو بعد میں آنے والا نبی ان کو زندہ اور تازہ کر دیتا۔

یہ اہتمام تو اللہ تعالیٰ نے اپنے اصل دین کو محفوظ کرنے کے لیے فرمایا ہے۔ اب آئیے دیکھیے کہ اس دین کو دنیا میں پھیلانے اور خلق پر اس کی حجت قائم کرنے کے لیے کیا اہتمام فرمایا ہے؟

اس کے لیے یہ اہتمام فرمایا ہے کہ تبلیغ و دعوت کی ذمہ داری پوری ایک امت کی امت پر ڈال دی ہے جو ہر دور میں، ہر ملک میں اور ہر زبان میں یہ خدمت انجام دے سکتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس امت کے اکثر افراد اپنی اس ذمہ داری سے غافل ہیں بلکہ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہے کہ ان کے اعمال کی شہادت ان کے اس منصب کی ذمہ داریوں کے بالکل خلاف ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرنا چاہیے کہ تاریخ کا کوئی تاریک سے تاریک دور بھی ایسا نہیں گزرا ہے جس میں یہ امت شہادت علی الناس کا فرض ادا کرنے والوں سے بالکل ہی خالی ہو گئی ہو۔ اللہ کے بندوں نے یہ شہادت زبان سے بھی دی ہے، قلم سے بھی دی ہے، عمل سے بھی دی ہے اور ہر ملک، ہر زبان، ہر دور اور ہر طرح کے حالات کے اندر دی ہے۔ اس شہادت سے شہادت دینے والوں کو نہ امراء اور سلاطین کی تلواریں روک سکی ہیں نہ ان کی اشرفیوں کی تھیلیاں، نہ یہ عوام کی مخالفت سے دبے ہیں اور نہ خواص کی سازشوں سے، نہ ان کو کسی خوف سے دبایا جا سکا ہے اور نہ کسی طمع سے خریدا جا سکا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ اس طرح کے رجال کی تعداد ہر دور میں بہت تھوڑی رہی ہے لیکن ظاہر ہے کہ جگانے والوں کی تعداد اتنی نہیں ہوا کرتی جتنی تعداد سونے والوں کی ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ نبوت کا سلسلہ ختم نہ ہوا ہوتا، جاری ہوتا جیسے بھی کیا ہوتا، ہر شہر اور ہر قریہ میں تو نبی آنے سے رہا تھا، یہی ہوتا کہ وقفہ وقفہ کے ساتھ کوئی نبی تذکیر کے لیے آ جاتا، سو یہ کام ہر دور میں اللہ کے نیک اور خدا ترس بندوں کے ذریعے سے ہو رہا ہے اور قیامت تک

ہوتا رہے گا۔

یہ حقیقت بھی پیشِ نظر رہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ساری ذمہ داری صرف جگانے والوں ہی پر نہیں ہے بلکہ اس ذمہ داری کا کچھ حصہ جاگنے والوں پر بھی ہے۔ یہ دنیا جس کو آپ غافلوں کی دنیا کہتے ہیں، بہرحال ڈھوروں اور ڈنگروں کی دنیا نہیں ہے۔ اس میں بڑے بڑے سائنس دان، بڑے بڑے فلسفی، بڑے بڑے مصنف، بڑے بڑے پروفیسر اور بڑے بڑے مدبر اور سیاست دان پڑے ہوئے ہیں۔ یہ حضرات آسمان و زمین کے سارے قلابے ملاتے ہیں آخر کبھی انھیں خدا اور اس کے احکام کی تلاش کیوں نہیں ہوتی؟ ان کی ساری حِسیں زندہ ہیں آخر یہی حس کیوں مردہ ہو گئی ہے؟ یہ نہیں ہے کہ یہ حضرات خدا اور رسول، مسیحؑ اور محمدؐ سے ناواقف ہوں۔ خوب واقف ہیں اپنی سیاسی بازیگریوں میں اگر ضرورت پیش آجاتی ہے تو ان ناموں کو استعمال بھی کرتے ہیں، آخر یہ حضرات کبھی ان ناموں کی حقیقت پر ایمان داری اور سچائی کے ساتھ کیوں نہیں غور کرتے۔ انھیں عوامی گیتوں اور عوامی ناچوں کے احیاء کی فکر تو بہت پریشان رکھتی ہے آخر انھیں خدا کے دین کے احیاء کی فکر کبھی کیوں نہیں لاحق ہوتی۔

میں تو ان عقلاء و فضلاء کے معاملہ پر جب غور کرتا ہوں تو مجھے یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ ان کو جگانے کے لیے تو ان کی عقل کو کافی ہونا چاہئے تھا۔ اگر وہ کافی نہیں ہے تو ان کے لیے کوئی چیز بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ ان سے تو اللہ تعالیٰ یہی پوچھے گا کہ ہماری بخشی ہوئی عقل کے راکٹ پر سوار ہو کر آپ حضرات چاند تک پہنچ گئے کیا کبھی اس عقل نے ہمارے دروازے کی طرف آپ لوگوں کی رہنمائی نہیں کی؟ اس دور کے لوگوں پر میرے نزدیک ان کی عقل پوری طرح خدا کی حجت تمام کر رہی ہے۔

میرے اس بیان سے کسی کو یہ بدگمانی نہ ہو کہ میں اس امت کو اس کی دعوتی ذمہ داریوں سے بری الذمہ ٹھہرانا چاہتا ہوں۔ میرا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے فریضہ تبلیغ و دعوت میں کوئی کوتاہی ہو جاتی تو اللہ تعالیٰ ان سے بھی مواخذہ کرتا پھر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری حضورؐ کے بعد اس امت پر ڈالی گئی ہے اگر اس امت کے لوگ اس کو ادا کرنے میں کوتاہی کریں گے تو اس کے مواخذہ سے کس طرح بچ سکیں گے؟ ہم میں سے ہر شخص اپنی صلاحیتوں اور اپنے اختیارات کے اعتبار سے اس بارے میں خدا کے ہاں مسئول ہو گا اور مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں ہے کہ اس خلق کی وہ تمام گمراہیاں جو ہماری غفلتوں کے نتیجہ میں ظہور میں آئیں گی ان کے نتائج بھگتنے میں ہم بھی برابر کے شریک ہوں گے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی روایتِ حدیث اور حضرت عمرؓ

۴۔ حضرت ابوہریرہؓ کو حضرت عمرؓ نے جو تنبیہ فرمائی اس سے آپ نے جو نتیجہ نکالا ہے وہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی بڑا ہی محتاط ہو لیکن اس کے باوجود اس سے کوئی غفلت ایسی ہو جائے جس کی بنا پر وہ تنبیہ کا سزاوار قرار پائے۔ اسی طرح اس بات کا بھی امکان ہے کہ جس بات پر اس کو تنبیہ کی گئی ہے اس میں وہ حق بجانب ہو لیکن کسی غلط فہمی یا شدتِ احتیاط کی بنا پر اس کو تنبیہ کی گئی ہو۔ میں تو آپ کے بالکل برعکس اس واقعہ سے روایت و حفاظتِ حدیث کے بارے میں دو نہایت اہم حقائق تک پہنچا ہوں۔

ایک تو یہ کہ حضرت عمرؓ جس طرح امت کے سارے ہی معاملات میں نہایت محتاط اور بیدار مغز تھے اسی طرح احادیث کی حفاظت و صیانت کے معاملہ میں بھی وہ نہایت بیدار مغز اور محتاط تھے۔ ان کی شدتِ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حضرت ابوہریرہؓ جیسے صحبت یافتہ نبیؐ شخص کی کسی روایت پر بھی جب انھیں ذرا شک گذر گیا ہے تو ان کو تنبیہ کرنے سے بھی وہ باز نہیں رہے ہیں۔ ایک ایسے بیدار مغز اور محتاط شخص کے متعلق یہ گمان کس طرح کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس معاملہ میں کسی کو بھی بخش سکتا ہے۔ اوّل تو حضرت عمرؓ کے رعب و دبدبہ کے ہوتے کسی کو ان کے زمانہ میں یہ جرأت ہی نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کوئی غلط بات منسوب کرے لیکن اگر کوئی ایسی جرأت کر بیٹھتا تو حضرت عمرؓ اس کی خبر لیے بغیر کب رہتے۔ ظاہر ہے کہ احادیث کا بیشتر حصہ اسی دور میں نقل و روایت میں آکر اہلِ علم کے حلقوں تک پہنچ گیا ہے۔ اس محتاط دور کی روایات کے متعلق کون یہ گمان کر سکتا ہے کہ یہ عجمی سازشوں کے نتیجہ کے طور پر ظہور میں آگئی ہیں۔

دوسری حقیقت یہ واضح ہوتی ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ بڑے ہی صاحبِ کردار، بڑے ہی صاحبِ اعتقاد اور نہایت ہی ذمہ دار راوی ہیں۔ اگر وہ کوئی ایسے ویسے راوی ہوتے تو حضرت عمرؓ کی ایک ہی ڈانٹ کے بعد ان کا حوصلہ پست ہو جاتا اور وہ روایتِ حدیث کا نام بھی نہ لیتے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ انھوں نے پورے تسلسل کے ساتھ حضورؐ کے زمانہ سے لے کر بنی امیہ کے ابتدائی دور تک اس خدمتِ دین کو جاری رکھا اور ایک لمحہ کے لیے بھی اپنے اس کام میں سست نہیں پڑے۔ اپنے کام میں یہ استقامت اور وہ بھی حضرت عمرؓ جیسے بیدار مغز اور سخت گیر خلیفہ کے دور میں وہی شخص دکھا سکتا ہے (باقی صفحہ پر

بقیہ "تذکرہ و تبصرہ"

(۳)

تفسیر آیۂ بسم اللہ و سورہ فاتحہ کی طباعت میں خلاف توقع کچھ تاخیر ہو گئی لیکن اس تاخیر کے باوجود خیال تھا کہ رمضان شریف کے آخری عشرہ میں کتاب اپنے قدر دانوں تک پہنچ جائے گی، مگر عین وقت پر یہ معلوم ہوا کہ اس وقت بازار میں سرورق کے لیے کوئی موزوں کاغذ نہیں مل رہا ہے۔ اس رکاوٹ نے مزید تاخیر پیدا کر دی۔ اب یہ چیز ایسی ہے جس پر ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے اس وجہ سے امید ہے کہ کتاب کے قدر دان ہمیں معذور سمجھیں گے۔ سرورق کے لیے کاغذ ملتے ہی ان شاء اللہ کتاب کی ترسیل شروع ہو جائے گی۔

یہ کتاب ہم نے میثاق کے سائز پر چھاپی ہے۔ اگرچہ اس حجم کی کسی کتاب کے لیے یہ سائز موزوں نہیں تھا، یہ چھوٹے سائز پر چھپتی تو خوبصورت رہتی لیکن ہم نے یہ چاہا کہ جن لوگوں کو جون کا میثاق نہیں مل سکا ہے وہ جون کے پرچہ کی جگہ اس کو اپنی فائل میں بھی لگا سکیں۔

ہندوستان میں جو لوگ اس کتاب کو خریدنا چاہیں وہ اس کی قیمت محصول ڈاک کے ساتھ ملا کر الفرقان کچہری روڈ لکھنؤ کو بھیج دیں۔ قیمت ۱۲؍ روپے۔

(۴)

مطالعہ حدیث کے باب کے تحت مولانا عبدالغفار حسن صاحب کے مضامین کا ایک سلسلہ اس اشاعت سے شروع ہوا ہے۔ اگرچہ خاص اس مضمون کے لیے جو اس اشاعت میں دیا گیا ہے "مطالعہ حدیث" کا عنوان بعض لوگوں کو ممکن ہے ناموزوں نظر آئے لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ یہ مضمون ایک سلسلہ مضامین کی صف اول کی کڑی ہے۔ درحقیقت اس باب کے تحت ہم ان تمام مباحث سے تعرض کرنا چاہتے ہیں جو اس وقت حدیث سے متعلق بعض فتنہ پردازوں نے پیدا کر رکھے ہیں جس طرح تدبر قرآن کے عنوان سے قرآنی مشکلات کے حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، اسی طرح مطالعہ حدیث کے عنوان سے ہم مشکلات حدیث کے حل کرنے میں قارئین میثاق کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے سلسلہ مباحث کا پورا نقشہ بنا لیا ہے۔ اس باب کے تحت مولانا عبدالغفار حسن صاحب بھی لکھیں گے اور خدا نے چاہا تو دوسرے اہل قلم بھی لکھیں گے۔ بعض ضروری چیزیں ہمارے پیش نظر بھی ہیں، ان شاء اللہ وہ بھی فرصت ملتے ہی ہم قلمبند کرنے کی کوشش کریں گے۔